البیان

تفسیر سورۃ الحمد

الامام الخوئی

(نجف الاشرف - عراق)

RS.020.00



لا اله الا الله
محمد رسول الله
Imamia Students Organization
IMAMIA LIBRARY
Mochi Gate Unit,


MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No. 088478
MAILSI


Islamia Students Organization Pakistan
Lahore Division


TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

البیان

تفسیرِ سورۃ الحمد

الامام الخوئی

(نجف الاشرف - عراق)

جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان

مترجم ________ محمد فضل حق

مدیر ________ رضا حسین رضوانی

کتابت ________ اشرف راحت

تصحیح ________ کاظم علی گجراتی

مطبع ________ شاہین پیکیجز۔ کراچی

فہرست

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ
يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا، قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَأْسًا شَدِيْدًا،
مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ
الصَّالِحَاتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ
اَبَدًا * كِتَابٌ اُحْكِمَتْ اٰيَاتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ
لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ * لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ
يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ *
ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ *
نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ * مَا كَانَ حَدِيْثًا
يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ
كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ * وَاِنَّهٗ
لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ وَسَوْفَ تُسْئَلُوْنَ *

وَافضَلُ صَلَوَاتِ اللهِ وَاكملُ تسليماتِهِ عَلىٰ
رَسُولِهِ الَّذِي ارسَلَهُ بِالهُدیٰ وَدِينِ الحَقِّ
لِيُظهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوكَرِهَ المُشرِكُونَ *
اَلنَّبِيَّ الاُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكتُوبًا عِندَهُم
فِي التَّوراةِ وَالاِنجِيلِ يَأمُرُهُم بِالمَعرُوفِ وَ
يَنهاهُم عَنِ المُنكَرِ *
وَعَلىٰ آلِهِ المُصطَفَينَ الاَخيارِ * اَلَّذِينَ آمَنُوابِهِ
وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي اُنزِلَ
مَعَهُ * اُولٰئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ وَالشُّهَدَاءُ عِندَ
رَبِّهِم لَهُم اَجرُهُم وَنُورُهُم * رَضِيَ اللهُ عَنهُم
وَرَضُوا عَنهُ اُولٰئِكَ حِزبُ اللهِ اَلَا اِنَّ حِزبَ
اللهِ هُمُ المُفلِحُونَ *
وَاللَّعنَةُ الدَّائِمَةُ عَلىٰ اَعدَائِهِم * اَلَّذِينَ اشتَرَوُا
الضَّلَالَةَ بِالهُدیٰ فَمَا رَبِحَت تِجَارَتُهُم وَمَا
كَانُوا مُهتَدِينَ * يَومَ يَخرُجُونَ مِنَ الاَجدَاثِ
سِرَاعًا كَاَنَّهُم اِلىٰ نُصُبٍ يُوفِضُونَ خَاشِعَةً
اَبصَارُهُم تَرهَقُهُم ذِلَّةٌ ذٰلِكَ اليَومُ الَّذِى
كَانُوا يُوعَدُونَ * يَومَ لَا يَنفَعُ الظّٰلِمِينَ مَعذِرَتُهُم
وَلَهُمُ اللَّعنَةُ وَلَهُم سُوءُ الدَّارِ *



عرضِ مؤلف

مجھے بچپن ہی سے قرآنِ کریم کی تلاوت، اس کے مشکل مقامات کو سمجھنے اور اس عظیم آسمانی کتاب کے اسرار وحقائق کے دریافت کرنے سے گہری دلچسپی رہی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ ہر سچے مسلمان کے لیے بلکہ ہر اس شخص کے لیے جو علم کا طالب اور حقیقت کا جویا ہو یہ ضروری ہے کہ وہ قرآن سے اکتسابِ نور کی خاطر اسے سمجھنے اور اس کے اسرار و رموز کو دریافت کرنے پر خاص توجہ صرف کرے۔

بلاشبہ قرآن ہی وہ تنہا کتاب ہے جو انسانیت کی فلاح وبہبود کی ضامن ہے اور جو انسانی معاشرے کی اصلاح کی قرار واقعی ذمے داری لے سکتی ہے۔ یہ وہ کتابِ محکم ہے جس کا نفع سب کے لیے عام ہے اور جس کی ہدایت ہر شخص کے لیے واضح اور روشن ہے۔

قرآن، لغت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے حوالے کی سب سے بڑی کتاب ہے۔ علمِ نحو کا ذوق رکھنے والوں کے لیے بہترین رہنما ہے۔ مذہبی علماء اور فقہاء کے لیے اعلیٰ ترین سند ہے، ادیبوں کے لیے زندۂ جاوید نمونہ ہے۔ یہ ہر فلسفی کے لیے ایسی دلیل وبرہان ہے جس کی اسے تلاش ہے، یہ ہر خطیب اور واعظ کے لیے سرچشمۂ فیض ہے، یہ عالمانِ علمِ اخلاق کا کعبۂ مقصود ہے، یہ ہر علم کے جاننے والوں کے لیے ان کے اپنے مخصوص شعبہ میں پشت پناہ اور چراغِ راہ ہے۔

قرآن معاشرتی اور سیاسی علوم کا منبع اور دستور العمل ہے۔ اس سے انسانی معاشرے کے نظم ونسق کے لیے بہترین اور آسان ترین قانون اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ مختلف دینی علوم کی بنیاد اسی پر قائم ہے۔ یہ قرآن ہی ہے جس نے تخلیق کے محیّر العقول اسرار اور قوانین سے پردہ اٹھایا ہے۔ قرآن زندۂ جاوید معجزہ ہے جو ایک لافانی قانون پر مشتمل ہے۔ یہ ایک ارفع و اعلیٰ آسمانی مذہب کا عظیم الشان لائحہ عمل ہے۔

اسی بنا پر مجھے بچپن ہی سے قرآن کو سمجھنے کا شوق تھا اور میں اسکے حقائق و معارف کو دریافت کرنے اور اس کے اغراض و مقاصد سے واقفیت پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کرتا رہتا تھا۔ جب بھی کوئی نئی بات دریافت ہوتی یا کوئی مشکل حل ہو جاتی، میری خوشی کی انتہا نہ رہتی اور میرے شوق و ذوق میں اضافہ ہو جاتا۔

اسی شوق و ذوق کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے تفسیر کی کتابوں کا بنظرِ عمیق مطالعہ شروع کر دیا۔ اس وقت مجھے ایک عجیب احساس ہوا۔ مجھے یہ معلوم ہوا کہ قرآن اور اس کے نازل کرنے والے کی عظمت کے سامنے انسان کی تشریح و تفسیر کی کچھ بھی حقیقت نہیں۔ انسان کی سوچ ہرگز قرآن کی بلندیوں تک نہیں پہنچ سکتی۔

میں نے دیکھا کہ خود آدمی اپنے آپ کو حق تعالےٰ شانہ، کی عظمت و کبریائی کے مقابلے میں جتنا حقیر، عاجز اور ناقص خیال کرتا ہے، درحقیقت وہ اس سے بھی کہیں زیادہ عاجز اور ناقص ہے۔

جوں جوں قرآن کی عظمت میری نگاہ میں بڑھتی گئی، اسی قدر تفسیر اور اس نوع کی دوسری کتابوں کی وقعت کم ہوتی چلی گئی۔

تفسیر کی کتابوں کے مطالعے سے یہ راز کھلا کہ کچھ لوگوں نے بڑی جدوجہد اور کوشش کے بعد قرآن مجید کے چند مختصر حقائق دریافت کر کے انہیں کتابوں میں

مدوّن کیا ہے جن کا نام تفسیر رکھ دیا ہے لیکن ایسی تفسیر جس سے سب غوامض حل ہو سکیں اور تمام نکات اور حقائق واضح ہو جائیں محال ہے ۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان جس کی ہستی ناقص اور جس کی قابلیت محدود ہے، اس کلام کے تمام نکات کا احاطہ کر سکے جو ایک انسانِ کامل پر اس خدائے لم یزل ولا یزال نے نازل کیا جس کی ہستی لامحدود اور جس کی صفات غیر متناہی ہیں۔

لیکن اس بات کے باوجود بھی علماء اور مفسرین کی کوشش ہر گونہ ستائش اور تشکر کی مستحق ہے ۔ ان کا یہ علمی جہاد اور یہ کوشش عنداللہ ضرور ماجور ہوگی ۔ کیونکہ آخر کتاب الٰہی نے ان کے دل کو اپنے نور کی کچھ شعاعوں سے منور کیا ہے اور کچھ نہ کچھ ہدایت و رہنمائی کی راہیں ان کے لیے کھولی ہیں ۔ یہ توقع تو بہر حال کسی شخص سے بھی نہیں کی جا سکتی چاہے وہ علم و دانش کے کتنے ہی اعلیٰ مرتبے پر فائز کیوں نہ ہو کہ وہ قرآن کے تمام معانی اور مفاہیم کے سب پہلوؤں کا احاطہ اور تمام نکات کا ادراک کر سکے گا۔

ان مفسرین پر ایک ہی اعتراض کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انھوں نے قرآنی علوم کے صرف ایک چھوٹے سے حصے سے بحث کی ہے اور بہت بڑے حصے کو جس سے قرآن کی عظمت و شان پر واقعی روشنی پڑتی تھی بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ مثلاً بعض مفسرین نے قرآن کی تفسیر محض لغت اور عربی زبان کے قواعد کو پیش نظر رکھ کر کی ہے ۔ کچھ دوسروں نے فلسفیانہ نقطۂ نظر سے قرآن کا مطالعہ کیا ہے ۔ کچھ اور مفسرین نے علوم جدیدہ کی روشنی میں قرآن کی تفسیر کی ہے ۔ اس پر طرہ یہ کہ تمام مفسرین یہی سمجھتے ہیں کہ ان کا اپنا نقطۂ نظر قرآن کی صحیح تفسیر ہے اور قرآن اسی معنی و مفہوم میں نازل ہوا ہے جو انھوں نے سمجھا ہے ۔ بعض لوگوں نے تو یہ کمال کیا ہے کہ تفسیر لکھی

ہے لیکن ان کی کتاب میں تفسیری مباحث بہت ہی کم نظر آتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے اپنی ذاتی رائے یا ایسے دوسرے لوگوں کی رائے کے مطابق تفسیر کی ہے جن کی رائے کی اللہ تعالیٰ نے توثیق نہیں کی اور اسے قطعاً مستند قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ان تفسیروں میں سے کوئی ایک بھی اشکال سے خالی نہیں کیونکہ مفسر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی شخصی رائے اور ذاتی عقائد سے قطع نظر کر کے صرف قرآن کے مفہوم کو بغیر کسی رنگ آمیزی کے پیش نظر رکھے اور اسی شعبہ پر انحصار نہ کرے جس میں اسے کمال حاصل ہو بلکہ قرآن کے اشاروں کو سمجھے اور ان کی رہنمائی میں قدم اٹھائے۔ زیادہ آسان الفاظ میں خود قرآن سے رہنمائی حاصل کر کے ظاہر آیات کے مطابق تفسیر کرے۔ اپنے ذاتی خیالات اور عقائد کو دخل نہ دے اور اپنے فکری ذوق کی رو میں نہ بہ جائے۔

صحیح معنی میں مفسر وہی ہے جو قرآن کے فلسفیانہ مباحث کا ایک ماہر فلسفی کے نقطۂ نظر سے اور اخلاقی مسائل کا اخلاقیات کے عالم کی نگاہ سے مطالعہ کر کے اور فقہی مسائل کو ایک محقق فقیہہ کی آنکھ سے اور عمرانی مسائل کو عمرانیات کے ماہر کی نظر سے دیکھ کر تفسیر کرے۔ اسی طرح قرآن کے سب علوم کی تشریح و توجیہہ متعلقہ علم کے مقتضٰی کے مطابق کرے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مفسر کو تمام قرآنی علوم و فنون میں کافی دسترس حاصل ہو اور اس کے پاس ہر علم اور فن سے متعلق وسیع معلومات کا ذخیرہ موجود ہو تاکہ وہ حسبِ موقع و ضرورت ان سب علوم و فنون سے کام لے سکے۔ اس کے بعد ہی مفسر قرآن کی تفسیر ایک ایسی کتاب کی شکل میں تیار کر سکتا ہے جو دسیوں جلدوں پر مشتمل ہو اور تفسیر کی ایک جامع انسائیکلوپیڈیا کا کام دے سکے۔

یہی وجہ تھی کہ میں نے ضروری سمجھا کہ قرآن کی ایک ایسی تفسیر لکھوں جس میں

تفسیر کی تمام خوبیاں موجود ہوں اور وہ قرآن سے متعلق سب ضروری نکات پر حاوی ہو۔ خدائے بزرگ و برتر سے دعا ہے کہ وہ اس مقصد کے حصول میں میری مدد کرے، مجھے اس مقدس آرزو کی تکمیل کی سعادت سے بہرہ ور کرے اور میری کوتاہیوں اور لغزشوں سے درگزر فرمائے۔

اس تفسیر میں ہم فقط انہی موضوعات سے بحث کریں گے جن کا تعلق قرآن کے معانی سے ہے۔ جن موضوعات کا تعلق قرآن کے الفاظ، اعراب یا ادبی علوم سے ہے ان پر گفتگو کا ارادہ نہیں، کیونکہ ان مباحث پر علماء اور مفسرین پہلے ہی متعدد ایسی کتابیں لکھ چکے ہیں کہ اب مزید کسی کتاب کی ضرورت نہیں رہی۔ ان کتابوں میں قابلِ ذکر شیخ طوسی کی تبیان، طبرسی کی مجمع البیان اور زمخشری کی کشّاف ہیں۔

البتہ جہاں ضروری ہوا بعض ایسے ادبی نکات بیان کر دیے جائیں گے جو دوسرے مفسرین سے نظر انداز ہو گئے ہیں یا ان کی اصل بحث سے خصوصی تعلق کی بنا پر اہمیت ہے۔

یہاں ہم قارئین کی توجہ ان دو نکتوں کی طرف مبذول کرانا ضروری سمجھتے ہیں:

۱- اس تفسیر میں ہم نے مندرجہ ذیل امور پر اعتماد کیا ہے اور انہی کو اپنے لیے حجت اور سند قرار دیا ہے:

(ا) آیات قرآنی کا متبادر مفہوم۔
(ب) وہ محکم آیات جن کے معنی بالکل واضح ہیں۔
(ج) وہ روایات جن کی صحت کثرتِ نقل اور تواتر کی بنا پر ثابت ہے۔
(د) وہ احادیث جو اہل بیتؑ سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہیں۔
(ہ) فطری عقل جو انحراف اور غلط رنگ آمیزی سے محفوظ ہو، کیونکہ عقل ہی

حجتِ باطنی ہے اسی طرح جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کا خاندان حجتِ ظاہری ہے۔

۲۔ ہم عام طور پر ایک آیت کی تفسیر کے لیے دوسری آیات کے مفہوم سے استفادہ کریں گے اور قرآن کو سمجھنے کے لیے خود قرآن ہی سے مدد اور رہنمائی حاصل کریں گے۔ اس طرح جو مفہوم حاصل ہوگا اس کی مزید تائید کے لیے احادیث سے استشہاد کریں گے۔

تفسیر کے مقدمہ میں بعض ایسے اہم مسائل پر بحث کی گئی ہے جن کا اصل تفسیر سے نہایت گہرا اور قریبی تعلق ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مقدمہ کے مباحث سے تفسیر کے بعض مخفیہ گوشوں پر روشنی پڑے اور ساتھ ہی تفسیر سے متعلق مفسر کے افکار اور اس کے نقطۂ نظر کی بھی وضاحت ہو جائے۔

اس مقدمہ میں قرآن سے متعلق بعض علمی اور اصولی مباحث پر گفتگو کی گئی ہے جیسے: قرآن کی عظمت، قرآن کا اعجاز، قرآن کی تحریف سے محفوظیت، قرآن میں عدم تناقض، قرآنی احکام میں نسخ کا نہ ہونا اور اسی طرح کے دیگر مسائل جو صحیح اور علمی تفسیر کی بنیاد ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس سلسلے میں مزید کامیابی عطا فرمائے اور قرآن کی اس خدمت کو قبول کرے۔

مؤلف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○
الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ مٰلِكِ يَوْمِ
الدِّيْنِ ○ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ
نَسْتَعِيْنُ ○ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ
الْمُسْتَقِيْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِيْنَ
اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ
الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا
الضَّآلِّيْنَ ○

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی
اَشْرَفِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہِ
الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ وَاللَّعْنَۃُ الدَّائِمَۃُ
عَلٰی اَعْدَآئِھِمْ اَجْمَعِیْنَ مِنَ الْاٰنِ اِلٰی
قِیَامِ یَوْمِ الدِّیْنِ*

نزول کا مقام

مفسرین میں مشہور یہ ہے کہ سورۂ حمد "مکہ" میں نازل ہوئی لیکن بعض مفسرین کے قول کے مطابق یہ سورت مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔ پہلا نظریہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور اس کی تائید دو باتوں سے ہوتی ہے:

۱۔ سورۂ حمد وہ "سبع مثانی" [1] ہے جس کا ذکر سورۂ حجر کی ۸۷ ویں آیت میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"ہم نے تمہیں سبع مثانی اور قرآنِ عظیم عطا کیا ہے۔"

---

[1] اس امر کی وضاحت بہت سی روایات میں کی گئی ہے جن میں صدوق اور بخاری کی بیان کردہ روایات شامل ہیں جنہیں ہم بعد میں نقل کریں گے۔

یہ آیت جس میں سورۂ حمد اور سبع مثانی کے نازل ہونے کا ذکر ہے۔ سورۂ حجر کی ہے اور وہ ان سورتوں میں سے ہے جو بلا شبہ مکہ میں نازل ہوئیں لہٰذا یہ ضروری ہے کہ سورۂ حمد بھی مکہ میں نازل ہوئی ہو۔

۲۔ سورۂ حمد کے مکی ہونے کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ نماز کا حکم مکہ میں آیا ہے اور تمام مسلمان اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام میں کبھی کوئی ایسی نماز ادا نہیں کی گئی جس میں سورۂ حمد شامل نہ رہی ہو۔ رسول اکرمؐ نے بھی اس بارے میں بالصراحت فرمایا ہے کہ سورۂ حمد کے بغیر نماز صحیح نہیں ہے اور یہ حدیث شیعہ اور سنی دونوں مکاتب کے محدثین نے نقل کی ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی ہے اور ابتدا ہی سے مسلمان اس سورت کی تلاوت کے ساتھ نماز ادا کرتے رہے ہیں۔

تاہم بعض مفسرین نے ایک تیسرا نظریہ اختیار کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ سورۂ حمد اپنی عظمت اور اہمیت کی بنا پر دو مرتبہ نازل ہوئی ہے ــــ ایک مرتبہ مکہ میں اور دوسری مرتبہ مدینہ میں۔

یہ نظریہ بھی بجائے خود صحت اور امکان سے خالی نہیں لیکن کوئی ایسی دلیل موجود نہیں جو اسے ثابت کر سکے یا اس کی تائید کرے۔ شاید دو مرتبہ نازل ہونے کی بنا پر ہی اس سورت کو سبع مثانی کہا گیا اور ممکن ہے چونکہ یہ سورت ہر نماز میں دو بار (یعنی پہلی اور دوسری رکعت میں) پڑھی جاتی ہے اس لیے اسے سبع مثانی کا نام دیا گیا ہو۔

سورۂ حمد کی فضیلت

اس مبارک سورت کی فضیلت کے بارے میں صرف یہ کہنا ہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ حجر میں اسے قرآن مجید کا ہم پلہ قرار دیا ہے اور نماز میں اس کا پڑھنا اس قدر ضروری ہے کہ قرآن مجید کی کوئی اور سورت اس کی جگہ نہیں لے سکتی، گویا کہ مومن کی پہچان اور دین کا ستون نماز ہے اور نماز کی جان سورۂ فاتحہ ہے۔

جو علوم و معارف اس سورت میں موجود ہیں، انشاء اللہ ہم آئندہ صفحات میں مختصر طور پر ان کا ذکر کریں گے۔

شیخ صدوقؒ اپنی اسناد کے ساتھ امام حسن عسکری علیہ السلام سے اور وہ اپنے عالی مرتبت اجداد کے توسط سے حضرت امیرالمومنینؑ سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ سورۂ حمد کی ایک آیت ہے اور اس آیت سمیت یہ سورت سات آیتوں پر مشتمل ہے۔ امیرالمومنینؑ نے مزید فرمایا: میں نے رسولِ اکرمؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اے محمدؐ! ہم نے تمہیں سبع مثانی اور قرآنِ عظیم عطا کیا ہے۔" پس سورۂ حمد کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان فرمایا اور اسے قرآنِ عظیم کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔ بلاشبہ سورۂ حمد عرش الٰہی کے گرانبہا خزانوں میں سے ہے۔

بخاری میں ابو سعید بن معلی سے منقول ہے:

"میں نماز پڑھنے میں مشغول تھا۔ دریں اثنا رسولِ اکرمؐ نے مجھے پکارا لیکن میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ نماز کے بعد میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ!

میں نماز پڑھ رہا تھا اس لیے میں نے آپ کے بلانے پر کوئی جواب نہیں دیا۔

اس پر آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا:

"جب اللہ اور اس کا رسولؐ تمہیں بلائیں تو جواب دو"۔ [1]

پھر رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: کیا تم چاہتے ہو کہ اس سے پہلے کہ تم مسجد سے باہر نکلو ہم تمہیں قرآن کی سب سے عظیم الشان سورت پڑھائیں؟ پھر آپ نے میرا ہاتھ پکڑا اور مسجد سے باہر نکلنے لگے۔

میں نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! آپ نے فرمایا ہے کہ آپ مجھے قرآن کی عظیم الشان سورت پڑھائیں گے۔ پس آنحضرتؐ نے مجھے سورۂ حمد پڑھ کر سنائی اور فرمایا: یہ سورت وہی سبع مثانی اور قرآنِ عظیم ہے جو ہمیں دیا گیا ہے۔ [2]

سورۂ حمد کی آیات کی تعداد

مسلمانوں میں یہ بات مشہور ہے کہ اس سورت کی سات آیتیں ہیں بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نظریے میں کوئی اختلاف بھی نہیں ہے۔

فقط حسن جعفی سورۂ حمد کا چھ آیتوں پر اور عمرو بن عبید نے آٹھ آیتوں پر مشتمل ہونا بیان کیا ہے۔ تاہم یہ دونوں روایتیں شاذ کے حکم میں اور مشہور نظریے کے خلاف ہیں کیونکہ:

۱۔ اکثر علمائے اسلام سورۂ حمد کو سات آیتوں پر مشتمل سمجھتے ہیں۔

۲۔ شیعہ اور سنی روایات سے بھی اس کی سات آیتیں ثابت ہوتی ہیں۔

---

[1] سورۂ انفال - آیت ۲۴

[2] صحیح بخاری جلد ۶ صفحہ ۱۰۳

2745

۲۔ قرآن مجید میں "سبع مثانی" سے مراد سورۂ حمد ہے اور اس سے بھی اس کے سات آیتوں پر مشتمل ہونے کا پتا چلتا ہے۔

پس جو لوگ بِسۡمِ اللّٰهِ کو ایک آیت اور سورۂ حمد کا جزو سمجھتے ہیں ان کے مطابق صِرَاطَ الَّذِيۡنَ سے سورت کے آخر تک کے الفاظ ایک آیت ہیں لیکن جو لوگ بِسۡمِ اللّٰهِ کو آیت شمار نہیں کرتے وہ غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ .... کو ایک الگ آیت قرار دیتے ہیں۔ اس طرح ان دونوں نظریوں کے مطابق سورۂ حمد کی سات ہی آیتیں ہوتی ہیں۔

سورۂ حمد کا مقصد

اس سورت کا مقصد انسان کو دو باتوں کی یاددہانی کرانا ہے۔ ان میں سے پہلی بات اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان رکھنا اور صرف اسی کی عبادت کرنا ہے کیونکہ اس کے علاوہ کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں ہے۔ دوسری بات قیامت اور سزا و جزا کے دن پر ایمان لانا ہے جس سے انسان کے اندر جواب دہی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ پیغمبرؐ اسلام کی بعثت کا حقیقی مقصد اور قرآن مجید کے نازل ہونے کی اصلی غرض و غایت یہی دو باتیں ہیں اور انہیں پر اسلام کی بنیاد قائم ہے کیونکہ یہ دین تمام بنی نوع انسان کو خدائے واحد پر ایمان لانے اور اس کی پرستش کرنے کی دعوت دیتے ہوئے باآواز بلند اعلان کرتا ہے کہ:

(اے رسولؐ) کہہ دیجیے کہ اے اہلِ کتاب میں تمہیں ایک ایسی بات کی طرف دعوت دیتا ہوں جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں

اور اللہ کے علاوہ ہم میں سے بعض لوگ کسی اور کو اپنا خدا اور پروردگار نہ سمجھیں"[1]۔
بلا شبہ بعثتِ رسولؐ اور نزول قرآن کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کے لوگوں کو کھلے الفاظ میں سمجھا دیا جائے کہ اللہ کے علاوہ کوئی شخص یا کوئی چیز حمد و ثنا اور عبادت کے لائق نہیں لہٰذا ضروری ہے کہ بنی نوع انسان کا ہر فرد جو عقل و شعور رکھتا ہو اس کی فروتنی اور توجہ صرف اللہ تعالےٰ کے لیے مخصوص ہو۔ اس مبارک سورت میں ان مطالب کو دلائل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے:

اگر کوئی سمجھ دار شخص کسی کے سامنے فروتنی کا اظہار کرتا ہے اور اس کی پرستش کرتا ہے اور اپنی حاجتیں اور خواہشیں اس کے سامنے پیش کرتا ہے تو اس کی وجہ وہ بزرگی اور کمال ہے جو اس کے خیال کے مطابق وہ دوسرا شخص رکھتا ہے کیونکہ ہر ناقص فطری طور پر کامل کے سامنے عاجزی اختیار کرتا ہے یا عاجزی اور فروتنی کا یہ اظہار اس احسان اور انعام کی بنا پر ہوتا ہے جو اسے اس شخص سے حاصل ہوتا ہے یا یہ فروتنی اس حاجت کی بنا پر ہوتی ہے جو اسے لاحق ہوتی ہے اور اس عاجزی کے ذریعے وہ اس سے کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے یا کسی نقصان سے اپنے آپ کو بچانا چاہتا ہے یا وہ جس شخص کی ستائش کرتا ہے اور اس کے سامنے جھکتا ہے وہ ستائش کرنے والے پر کوئی خاص تسلط اور برتری رکھتا ہے اور اس تسلط اور برتری کے نتیجے میں وہ شخص مجبور ہوتا ہے کہ اس شخص کی تواضع کرے، اس کے سامنے فروتنی اختیار کرے اور اس سے سرکشی اختیار کرنے اور اسکی نافرمانی کرنے سے خوف کھائے۔

---

[1] سورۂ آلِ عمران۔ آیت ۶۳

یہ وہ وجوہ اور اسباب ہیں جو عبادت اور فروتنی کا سبب بنتے ہیں۔
اگر ایک سمجھ دار شخص ان اسباب اور عوامل پر غور کرے تو وہ یقیناً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ تمام چیزیں خداوند تعالےٰ کی ذات میں جمع ہیں بلکہ اسی سے مخصوص ہیں لہٰذا وہی ہے جو حمد اور تعریف کے لائق ہے کیونکہ فقط وہی جمال اور کمال کی تمام صفات کا کامل طور پر مالک ہے اور تمام عیوب اور نقائص سے پاک ہے۔ وہی ہے جو تمام عوامل کو نعمت بخشتا ہے اور کائنات کے تمام عناصر اور موجودات کو جو وجود میں آچکے ہیں یا بعد میں پیدا ہوں گے ہستی بخشنے والا ہے۔ وہ خدا ہے جو تمام دنیاؤں کو پیدا کرکے اور ان کے لیے قانون وضع کرکے ان کی پرورش کرتا ہے اور کمال کی جانب ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ وہ وہی ہے جس کی رحمت لامحدود اور لازوال ہے۔ وہ مالکِ مطلق ہے اور تمام کائنات کا حقیقی فرمانروا ہے۔

بلاشبہ وہی سچا معبود ہے اور پرستش کے لائق ہے اور اس کے علاوہ کوئی اس قابل نہیں کہ اس کی عبادت اور پرستش کی جائے کیونکہ وہ مطلق اور لامحدود کمال کا مالک، حقیقی اور بے مثل منعم ہے اور وسیع رحمت اور مطلق سلطنت اسی کی ہے۔

کیا اس صورت میں ایک سمجھ دار شخص اس کے سوا کسی دوسرے کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے اور اس کے علاوہ کسی اور کی عبادت کر سکتا ہے؟ کیا وہ کسی دوسرے سے مدد مانگ سکتا ہے اور اس کے سوا کسی اور پر بھروسہ کر سکتا ہے؟ چونکہ اللہ تعالےٰ کے علاوہ ہر چیز اور ہر شخص "ممکن" ہے اور "ممکن" فطری طور پر محتاج اور ضرورت مند ہوتا ہے، لہٰذا مدد فقط اللہ تعالیٰ کی بے نیاز ذات سے مانگنی چاہیے کیونکہ وہی ہے جو بے نیاز ہے اور اس کے علاوہ

سب کے سب محتاج اور نیاز مند ہیں۔

"اے لوگو! تم سب کے سب اللہ کے محتاج ہو اور فقط اللہ ہی ہے جو بے نیاز اور ہر لحاظ سے حمد و ثنا کے لائق ہے۔[1]"

اس سورت میں حمد و ثنا کو اپنی ذات سے مخصوص کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اپنی زبانوں اور دل و جان کی گہرائیوں سے کہیں کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ یعنی اے پروردگار! ہم فقط تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

پھر اللہ تعالےٰ انسانوں کی حالت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ پیغمبروں کے آنے اور آسمانی کتابوں کے نازل ہونے کے بعد وہ تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔

پہلا گروہ: یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی روح پرور توجہ، نعمتوں اور عنایتوں سے بہرہ ور ہوئے ہیں اور ان کی رہنمائی سیدھے راستے کی جانب کی گئی ہے۔ اس راستے نے انہیں انسانیت کے آخری مقصد تک پہنچا دیا ہے اور وہ دائیں یا بائیں طرف نہیں بھٹکے۔

دوسرا گروہ: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے سیدھے راستے کو جو انسان کی رہنمائی ابدی خوش بختی کی جانب کرتا ہے گم کر دیا ہے اور دائیں یا بائیں جانب بھٹک گئے ہیں۔ اگرچہ وہ اپنی غلطی کی بنا پر سچائی کا راستا گم کر بیٹھے ہیں لیکن انہوں نے سچائی کے مقابلے میں دشمنی اور ہٹ دھرمی کا رویہ اختیار نہیں کیا۔ وہ جس راستے پر چل رہے ہیں اسے صحیح سمجھتے ہیں اور اگر وہ اپنی غلطی سے آگاہ ہو

---

[1] سورۂ فاطر۔ آیت ۱۵

جائیں اور انہیں سچائی کے راستے کا پتا چل جائے تو وہ اس سے منہ نہیں موڑتے اور نافرمانی اور سرکشی نہیں کرتے۔

تیسرا گروہ: یہ وہ لوگ ہیں جنہیں دولت اور مقام کی ہوس بغاوت کے راستے پر ڈال دیتی ہے اور وہ سچائی کے مقابلے میں ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہیں اور اس کے خلاف دشمنی پر اتر آتے ہیں خواہ وہ پہلے سچائی کو پہچانتے ہوں اور پھر اس سے منکر ہو گئے ہوں یا شروع سے ہی سچائی کو نہ پہچانتے ہوں۔ اس قسم کے لوگ درحقیقت اپنی نفسانی خواہشات کے بندے ہوتے ہیں اور انہیں کی پرستش اور پیروی کرتے ہیں۔

اللہ تعالٰے قرآن مجید کی ایک اور سورت میں اس گروہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"کیا تم نے اس شخص کو بھی دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا اور معبود بنا رکھا ہے[1]۔"

بلاشبہ یہ لوگ کفر اور گمراہی کے لحاظ سے زیادہ سخت اور سچائی کے مقابلے میں اپنی سرکشی اور خودسری کی بنا پر زیادہ عذاب کے مستحق ہیں اور دوسرے گروہ کی نسبت اللہ تعالیٰ ان پر زیادہ غضبناک ہوگا۔

انسان فطری طور پر دولت اور منصب کی محبت کے جذبے سے خالی نہیں ہوتا اور جب تک اللہ تعالٰے کی جانب سے ہدایت اس کے شامل حال نہ ہو وہ گمراہی اور ہوا و ہوس میں مبتلا ہونے سے محفوظ نہیں رہ سکتا جیسا کہ قرآن مجید میں اس حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:

---

[1] سورۂ جاثیہ۔ آیت ۲۲

"اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تمہارے شاملِ حال نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی کبھی پاکیزگی کی طرف مائل نہ ہوتا۔ بلاشبہ یہ اللہ ہی ہے کہ جسے چاہے پاک صاف کر دیتا ہے اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔"[1]

اگر اللہ تعالےٰ کی عنایت انسان کے شامل حال نہ ہو تو وہ اپنی ذاتی خواہشات کا اسیر ہو جاتا ہے اور اس بات کا امکان بڑھ جاتا ہے کہ وہ اپنی ہوا و ہوس سے مغلوب ہو جائے، اس لیے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کہتا ہے کہ وہ ہمیشہ اس سے ہدایت اور رہنمائی طلب کریں اور کہیں:

"اے پروردگار! تو ہمیں سیدھا راستا دکھا۔ ان لوگوں کا راستا جنہیں تو نے اپنی نعمت عطا کی ہے نہ ان لوگوں کا راستا جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور نہ ہی ان کا جو گمراہ ہو گئے۔"

ان جملوں میں نمازی اللہ تعالیٰ سے وہ ہدایت طلب کرتے ہیں جو مومنوں اور نیکوکاروں کے لیے مخصوص ہے اور اس سے عرض کرتے ہیں کہ وہ انہیں سیدھے راستے پر چلائے اور ان لوگوں میں شامل کرے جن پر اس نے اپنی نعمتیں نازل کی ہیں۔

ایک اور آیت میں اس سیدھے راستے پر چلنے والوں کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے:

"یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالےٰ نے اپنی نعمتیں دی ہیں۔

---

[1] سورۂ نور۔ آیت ۲۱

وہ پیغمبر ہیں اور آدمؑ کی اولاد میں سے ہیں، وہ ان لوگوں کی نسل سے ہیں جنہیں ہم نے طوفان میں نوحؑ کے ساتھ کشتی میں سوار کرا دیا تھا، وہ ابراہیمؑ اور یعقوبؑ کی اولاد میں سے وہ لوگ ہیں جن کی ہم نے ہدایت کی اور انہیں چن لیا۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ اس کی بارگاہ میں روتے ہوئے سجدے میں گر جاتے ہیں۔"[1]

پھر اللہ تعالےٰ اپنے بندوں کو ہدایت فرماتا ہے کہ وہ سیدھی راہ کو نہ پہچاننے یا اس سے بھٹک جانے سے اس کی پناہ مانگیں اور اس سے درخواست کریں کہ وہ انہیں مغضوب اور گمراہ لوگوں کے برے انجام سے محفوظ رکھے۔

خلاصہ

سورۂ حمد کے مفہوم کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کمالی اور جمالی اوصاف کے ساتھ اپنی تعریف کرتا ہے اور عالی افعال کے ذریعے سے اپنا تعارف کراتا ہے۔ وہ بنی نوع انسان کو عمومی تربیت، رحمت اور روز جزا کی سلطنت کی یاد دہانی کراتا ہے جس کا وہ مالک ہے۔ پھر وہ ان کو ذہن نشین کراتا ہے کہ عبادت، پرستش اور مدد اللہ تعالےٰ سے مخصوص ہیں اور اس کے علاوہ کوئی حمد و ثنا اور پرستش کے قابل نہیں۔ فقط اسی کی پرستش کرنی چاہیے اور اسی سے مدد مانگنی چاہیے۔

---

[1] سورۂ مریم - آیت ۵۸

پھر وہ لوگوں کو دعا مانگنے کا طریقہ سکھاتا ہے اور وہ انہیں بتاتا ہے کہ وہ اس سے درخواست کریں کہ وہ ان کی رہنمائی سیدھے راستے اور ابدی خوش بختی کی جانب کرے، انہیں ہمیشہ کی زندگی اور لازوال نعمتیں عطا کرے اور انہیں ایسے نور اور روشنی میں جگہ دے جس کے بعد کوئی تاریکی نہ ہو۔

آخری مرحلے پر وہ یہ نکتہ بیان کرتا ہے کہ یہ سیدھا راستا ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت اور فضل کے ساتھ نعمتیں عطا فرمائی ہیں اور ان پر خاص مہربانی کی ہے۔ یہ راستا ان لوگوں کے راستے سے جدا ہے جو اللہ تعالےٰ کے غیظ و غضب کا مورد قرار پائے ہیں یا سیدھے راستے سے بھٹک گئے ہیں۔

پس سورۂ حمد چار حصوں پر مشتمل ہے اور ہر حصے کا ایک خاص مقصد ہے۔ مجموعی طور پر یہ سورت مندرجہ ذیل چار بلند مقاصد کی نشان دہی کرتی ہے:

۱۔ یہ اعلیٰ اور کمال کی حامل صفات سے اللہ تعالیٰ کا تعارف کراتی ہے۔

۲۔ عبادت اور مدد اللہ تعالےٰ سے مخصوص ہے اور اس کے علاوہ کوئی اس قابل نہیں کہ اس کی عبادت کی جائے یا اس سے مدد مانگی جائے۔

۳۔ ہدایت پانے اور نیکو کاروں کے سیدھے راستے کی پہچان کے لیے اللہ سے دعا کرنی چاہیے۔

۴۔ نیک لوگوں کا راستا ان لوگوں کے راستے سے جدا ہے جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا ہے یا جو سیدھے راستے سے بھٹک گئے ہیں۔

آیۂ بسم اللہ کی تفسیر

آیت کے الفاظ کی وضاحت

اسم : لفظ "اسم" کے لغوی معنی علامت اور نشانی کے ہیں اور اس کا ہمزہ، ہمزۂ وصل ہے جو اس لفظ کے اصلی حروف میں شامل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس لفظ کو کسی دوسرے لفظ یا حرف کے ساتھ جوڑا جائے تو تلفظ میں ہمزہ ساقط ہو جاتا ہے اور "بِسْمِ اللّٰہ" میں تو یہ لکھا بھی نہیں جاتا۔

کلمہ "اسمٌ" کے لیے کئی ایک الفاظ اور تلفظ پائے جاتے ہیں جن میں سے چار بہت مشہور ہیں ۔ اسم اور سم یہ دونوں "س" کی زیر اور پیش کے ساتھ بھی پڑھے جاتے ہیں۔

لفظ اسم "سمو" سے لیا گیا ہے جس کے معنی بلندی کے ہیں اور یہ اس بنا پر ہے کہ کوئی معنیٰ یا وہ شخص جس کا کوئی نام رکھا گیا ہو، اُس نام

(اسم) کی وجہ سے بلندی حاصل کر لیتا ہے اور غیاب سے نکل کر ظہور میں آجاتا ہے، کیونکہ جب کوئی لفظ سنا جاتا ہے تو اس کے معنی سننے والے کے ذہن میں اجاگر ہو جاتے ہیں جب کہ پیشتر وہ چیز ذہن میں نہیں ہوتی یا اسم کو اس بنا پر اسم کہا جاتا ہے کہ جب ایک لفظ کسی معنی و مفہوم کے لیے وضع ہو جاتا ہے تو وہ اس نسبت سے بلندی اور قوت حاصل کر لیتا ہے اور باطن سے نکل کر منظر عام پر آجاتا ہے۔

بعض علماء نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "اسم" "سمة" سے مشتق ہے جس کے معنی علامت کے ہیں لیکن یہ نظریہ غلط ہے کیونکہ جیسا کہ ہم جانتے ہیں اسم کی جمع "اسماء" ہے اور اس کا مصغر (Diminative) سمی ہے اور اسے نسبت دیتے ہوئے سموی اور اسمی اور فعل متعدی بناتے وقت وسمت اور اوسمت کہا جاتا ہے۔

اللہ: یہ اسم علم اور اللہ تعالیٰ کی مقدس ذات کا خاص نام ہے۔ جاہلیت کے زمانے میں بھی عرب اس لفظ سے واقف تھے۔ دورِ جاہلیت کا شاعر لبید کہتا ہے:

الا کل شیٔ ماخلا اللہ باطل
وکل نعیم لامحالۃ زائل

(اللہ کے علاوہ ہر چیز باطل ہے اور ہر چیز لامحالہ زائل ہونے والی ہے)۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:

"اے رسولؐ! اگر تم ان بت پرستوں اور جاہل لوگوں سے

پوچھو گے کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ کہیں گے کہ اللہ نے[1]"

جن لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اللہ اسم علم اور خاص نام نہیں بلکہ اسم جنس ہے، انہوں نے غلطی کھائی ہے۔ اس کے اسم علم ہونے کو مندرجہ ذیل دلائل سے ثابت کیا جا سکتا ہے:

۱۔ "تبادر" (کسی چیز کا ذہن میں پہلے آنا)۔ لفظ اللہ کو لفظ جلالہ کا نام دیا جاتا ہے اور کسی مثال یا مماثلت کے بغیر جب اسے پروردگار کی مقدس ذات کے لیے بولا جاتا ہے تو سننے والے کے ذہن میں سب سے پہلے وہی معنی آتے ہیں۔ ذہن کا یہ جھکاؤ اور معنی کا یہ ظہور اس قدر واضح ہیں کہ کسی کو ان کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں اور اصالتہ عدم نقل کے قاعدے سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ لفظ بنیادی لغت میں اور ابتدا ہی سے انہیں معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے اور علم اصول میں بھی یہ قاعدہ بطور دلیل ثابت ہو چکا ہے۔

۲۔ مشتق نہ ہونا: لفظ جلالہ کے جو معنی بھی لیے جائیں وہ وصف کی صورت میں استعمال نہیں ہوتا۔ مثلاً "العالم اللہ" اور الخالق اللہ نہیں کہا جا سکتا اور عالم اور خالق کی تعریف لفظ اللہ سے نہیں ہو سکتی۔ اللہ کے لفظ کا وصف قرار نہ پانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ جامد ہے اور مشتق نہیں ہے اور جب اس کا جامد ہونا ثابت ہو گیا تو وہ لازمی طور پر اسم علم اور خاص نام ہے کیونکہ جو لوگ اسکے اسم جنس

---

[1] سورۂ لقمٰن۔ آیت ۲۵

ہونے کے قائل ہیں وہ اس کی تفسیر اسے مشتق تصور کرتے ہوئے کرتے ہیں حالانکہ اس کا مشتق ہونا ثابت ہی نہیں ہے۔

۳۔ کلمۂ توحید: اگر لفظ جلالہ علم اور خدائے تعالیٰ کا خاص نام نہ ہوتا تو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کو کلمۂ توحید کا نام نہ دیا جاتا اور اسے خداوند تعالیٰ کی وحدانیت پر دلیل نہ سمجھا جاتا۔ جیسا کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا الرَّازِقُ اور لَآ اِلٰہَ اِلَّا الْخَالِقُ اور ایسے ہی دوسرے جملے خدا کی توحید کی دلیل نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی بجائے یہ جملے استعمال کرے تو اس کا اسلام قابل قبول نہیں اور فقط یہ جملے ادا کرنے سے اسے اہلِ توحید قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۴۔ خاص نام کی ضرورت: نام اور الفاظ وضع کرنے کے پیچھے جو حکمت کارفرما ہے اس کا تقاضا ہے کہ جس طرح ہر اصلی مفہوم کے لیے ایک نام کا تعین کر دیا گیا ہے اسی طرح پروردگارِ عالم کی ذاتِ اقدس کے لیے بھی ایک خاص نام معین ہو لیکن ہم جانتے ہیں کہ عربی زبان میں خدا کی ذات کے لیے کوئی دوسرا لفظ وضع نہیں کیا گیا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لفظ اَللّٰہ اسی مقصد کے لیے وضع کیا گیا ہے اور یہی خدا کا خاص نام ہے۔

پہلا اعتراض

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ ایک معنی کے لیے ایک لفظ کا وضع اور معین کرنا اس بات پر منحصر ہے کہ جو شخص یہ کام انجام دے وہ اس لفظ اور معنی کو علیحدہ علیحدہ اپنے ذہن میں حاضر کر سکے اور اس کا تصور کر سکے لیکن لفظ اَللّٰہ میں

معنی کا تصور کرنا ممکن نہیں کیونکہ انسان جو ایک ممکن اور محدود وجود رکھتا ہے یہ اس کے بس کی بات نہیں کہ وہ خدائے تعالیٰ کی ذات کا احاطہ کرے یا اس کا تصور اپنے ذہن میں لا سکے جو کہ واجب اور لامحدود ہے "لہٰذا خدائے تعالیٰ کی ذات کے لیے کوئی لفظ وضع کرنا ممکن ہی نہیں۔

اس بات کا احتمال بھی اشکال سے خالی نہیں کہ خدا نے لفظ اَللّٰہ خود اپنی ذاتِ اقدس کے لیے وضع کیا ہو کیونکہ ہم یقینی طور پہ جانتے ہیں کہ لفظ اَللّٰہ خود خدا نے وضع نہیں کیا اور یہ کہ ایک لفظ کے وضع کرنے اور اسے معین کرنے کے علاوہ اس کے استعمال کے مرحلے پر بھی اس کے معنی بولنے والے کے ذہن میں موجود ہوں اور پھر وہ لفظ ان معنی میں استعمال کیا جائے لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ خدا کی ذات اقدس کا تصور کرنا انسان کے لیے ممکن نہیں تاکہ وہ اَللّٰہ کا لفظ استعمال کر سکے لہٰذا خدا کے لیے "علَم" اور معین کی شکل میں لفظ اَللّٰہ کا استعمال انسان کے لیے اسی طرح ممکن نہیں جس طرح اس کا وضع کرنا اور معین کرنا ممکن نہیں۔ نتیجہ اس گفتگو کا یہ ہے کہ لفظ اَللّٰہ علَم اور خدا کا خاص نام نہیں ہے۔

جواب

کسی معنی کے لیے کسی لفظ کے وضع کرنے کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ معنی اجمالی طور پہ بولنے والے کے ذہن اور تصور میں موجود ہوں خواہ وہ اشارتاً اور اندازاً ہی کیوں نہ ہوں۔ اس قسم کا مختصر اور اجمالی تصور دوسروں کے علاوہ خدائے تعالیٰ کی اقدس اور واجب الوجود ذات کے لیے بھی ممکن ہے۔

البتہ جس چیز کا تصور محال ہے وہ خدا کی کامل حقیقت اور اسکی بے پایاں

ذات کی کیفیت ہے جب کہ ایسا دقیق تصور الفاظ کے وضع کرنے اور ان کے استعمال کے لیے ضروری نہیں ہے۔ اگر ایسا دقیق اور وسیع تصور ضروری ہوتا تو نہ صرف خدا کا نام معین کرنے میں دقت پیش آتی بلکہ وہ تمام حقائق اور موجودات کہ جن کی کیفیت اور حقیقت مکمل طور پر انسان پر واضح نہیں مثلاً روح، فرشتے اور جنّ وغیرہ، ان کے لیے الفاظ وضع کرنا اور ان کے نام تجویز کرنا محال ہو جاتا۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ کسی کو اس بارے میں کلام نہیں ہے کہ خدا کی ذات کے لیے اسم اشارہ اور ضمیر استعمال کرنا صحیح ہے اور اسم اشارہ اور ضمیر سے خدا کی ذات مراد لی جا سکتی ہے لہٰذا اس میں کیا حرج ہے کہ ہم ایک لفظ بولیں اور اس سے خدا کی ذات مراد لیں اور اس لفظ کو اسم علَم یعنی اس کا ذاتی نام تصور کریں۔ چونکہ پروردگارِ عالم کی ذاتِ اقدس کمال اور عظمت کی تمام صفات کی مالک ہے اور نام وضع کرنے کے مرحلے پر ان صفاتِ کمال میں سے کسی ایک صفت کو خاص طور پر مدِّ نظر نہیں رکھا گیا، اس لیے کہنا چاہیے کہ لفظ اللّٰہ اس وجودِ مطلق کا خاص نام ہے اور اس میں کمال اور جمال کی تمام صفات شامل ہیں۔

دوسرا اعتراض

اگر لفظ اللّٰہ علَم اور ذاتی نام ہو تو اس آیت کے معنی صحیح نہیں ہوں گے جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

"وہی آسمانوں اور زمین میں خدا (اللہ) ہے۔[1]"

---

[1] سورۂ انعام - آیت ۳

کیونکہ اگر لفظ اللّٰہ خدا کی ذات کا خاص نام ہو تو اس صورت میں یہ آیت اس کے لیے مکان ثابت کرے گی جب کہ خدا مکان سے بے نیاز ہے اور وہ آسمان اور زمین میں کسی خاص جگہ پر مقیم نہیں ہے لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ لفظ "اللّٰہ" اسم علم اور خدا کا خاص نام نہیں ہے بلکہ معبود کے معنوں میں ہے۔ اس صورت میں اس آیت شریفہ کے معنی یہ ہوں گے: "وہی آسمانوں اور زمین میں معبود ہے۔"

جواب

ہم کہتے ہیں کہ اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی جگہ خدا کے وجود سے خالی نہیں ہے۔ وہی ہے جس نے ان تمام چیزوں کا احاطہ کر رکھا ہے جو آسمانوں اور زمین میں موجود ہیں اور یہ ممکن نہیں کہ کوئی موجود اس سے مخفی ہو۔ آیت کے بعد کے جملے اس معنیٰ کی تائید کرتے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ:

"اللہ تمہارے ظاہر اور باطن سے واقف ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اس سے پوری طرح آگاہ ہے۔"[1]

ابو جعفر — جو صدوقؒ کے خیال کے مطابق محمد بن نعمان ہیں — نقل کرتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیت شریفہ "آسمانوں اور زمین میں وہی خدا ہے" کی تفسیر دریافت کی۔

انہوں نے فرمایا: ہاں وہ ہر جگہ موجود ہے۔

---

[1] سورۂ انعام - آیت ۳

میں نے کہا: کیا وہ اپنے وجود اور ذات کے ساتھ ہر جگہ موجود ہے؟

امام نے فرمایا: اللہ تجھ پر رحم کرے۔ جگہیں محدود ہیں اور اگر تو کہے کہ خدا بذاتہ فلاں جگہ موجود ہے تو لازمی طور پر تجھے کہنا پڑے گا کہ وہ اس جگہ محدود ہے اور مخلوق کی سی دوسری صفات بھی رکھتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ وہ مخلوق سے جدا ہے تاہم اس کے علم، قدرت اور اقتدار نے ان سب چیزوں کا احاطہ کر رکھا ہے [1]

ال: اگرچہ لفظ "اللہ" کا الف اور لام اسمِ علَم اور خاص نام ہونے کی بنا پر اس کا حصہ ہے لیکن اس کے باوجود اس کا ہمزہ، ہمزۂ وصل ہے جو لکھتے وقت ساقط ہو جاتا ہے (مثلاً اِنَّ اللہَ) لیکن اگر وہ حرفِ ندا کے بعد واقع ہو (مثلاً یَا اَللّٰہُ) تو اس صورت میں ہمزہ ساقط نہیں ہوتا۔ یہ اس لفظ "اللہ" کی خصوصیات میں سے ہے اور عربی ادب میں اس صورت میں اس لفظ کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

ہمیں یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ لفظ "اللہ" منقول الفاظ میں سے ہے اور یہ ظاہری طور پر لفظ "لاہ" سے لیا گیا ہے جس کے معنی چھپنے، پوشیدہ ہونے اور بعض اوقات بلندی کے ہوتے ہیں۔ پس لفظ اللہ اسم فاعل ہے۔ پس اللہ کے معنی اسی بے حد بلند اور عالی رتبہ ذات کے ہیں جس تک کسی بھی طرح کی پستی راہ نہیں پا سکتی اور وہ ایک ایسا وجود ہے جس کی لامحدود علامتوں اور نشانیوں سے عالم وجود کو روشنی ملتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ خود لوگوں کی نظروں سے غائب اور پوشیدہ ہے۔ آنکھیں

---

[1] تفسیر برہان۔ جلد ۱۔ صفحہ ۳۱۵

اسے نہیں دیکھ سکتیں اور انسانوں کے تخیلات اس کی ذات کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے۔

ایک شاعر نے کہا ہے: "اے اللہ! اے عجوبۂ ہستی!! تیری حقیقت کو سمجھنے کی کوشش میں ذہن تھک ہار کر عاجز ہو گئے ہیں۔ تو وہ ہے جس نے صاحبانِ فہم کو حیران کر دیا ہے اور عقل کو مضطرب اور متحیر کر دیا ہے۔ جب کبھی میرا ذہن تجھے سمجھنے کے لیے ایک بالشت آگے بڑھتا ہے تو در اصل وہ ایک میل پیچھے جا پڑتا ہے۔ وہ شرمندہ سا ہو کر بے خبری کے اندھیرے میں قدم اٹھاتا ہے لیکن تجھ تک پہنچنے کا راستا اسے نہیں ملتا۔"

یہ بھی ضروری نہیں کہ ہم کہیں کہ لفظ اللہ کی اصل اِلٰہ ہے جس کے معنی "اس نے عبادت کی" یا "وہ متحیر ہوا" کے ہیں کیونکہ اس صورت میں ہمیں کہنا پڑے گا کہ لفظ اللہ اسم مفعول کے معنوں میں مصدر ہے جیسے کِتاب مکتوب اور لکھے گئے کے معنی میں ہے حالانکہ ہمیں اس بحث اور تاویل کی کوئی حاجت نہیں۔

رحمٰن

یہ لفظ "رحمت" سے مشتق ہے اور ظاہر ہے کہ یہ قساوت، سختی اور بے مہری کی ضد ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

> "پیغمبر اور ان کے ساتھی کافروں پر سخت اور آپس میں رحم دل اور مہربان ہیں۔"[1]

---

[1] سورہ فتح - آیت ۲۹

"جان لو کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے اور یہ بھی کہ وہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔"[1]

رحمت، خدا کی صفاتِ فعلیہ میں سے ہے لیکن اس سے خدا کے لیے رقیق القلبی اور نرم دلی مراد نہیں لی جاتی کیونکہ یہ قلب انسانی کی کیفیات ہیں۔ اگرچہ رقتِ قلب فطری طور پر رحمت کے لوازمات میں سے ہے لیکن یہ اس کا مفہوم مطلق نہیں ہے۔ پس خداوندِ کریم کی شان کو ملحوظ رکھتے ہوئے "رحمت" کے لفظ کو اس کے حقیقی معنوں سے ہٹائے بغیر اسے خدا سے نسبت دی جاتی ہے اور اس ضمن میں خلق اور رزق کا ذکر کیا جاتا ہے جو خدا کی صفات فعلیہ ہیں۔ چنانچہ جس وقت بھی اس کی حکمت اور مصلحت تقاضا کرتی ہے وہ یہ رحیمانہ فعل انجام دیتا ہے جیسے کہ فرماتا ہے:

"تمہارا خدا تمہارے حال سے خوب واقف ہے۔ وہ اگر چاہے تو تم پر رحم کرے اور چاہے تو تم پر عذاب کرے۔"[2]

"وہ جس پر چاہے عذاب کرے اور جس پر چاہے رحم کرے اور تم لوگ اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔"[3]

خدا اپنے بندوں کو قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں یاد دہانی کراتا ہے کہ وہ اس سے رحمت اور مغفرت طلب کریں مثلاً ارشاد ہوتا ہے:

"(اے رسولؐ) کہیے کہ اے پروردگار! (ہمیں) بخش دے اور ہم پر رحم فرما کہ تو سب رحم کرنے والوں سے بہتر ہے۔"[4]

---

[1] سورۂ مائدہ۔ آیت ۹۸ [2] سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۵۴

[3] سورۂ عنکبوت۔ آیت ۲۱ [4] سورۂ مومنون۔ آیت ۱۱۸

اکثر مفسرین اور بعض لغت نویسوں نے کہا ہے کہ رحمٰن رحمت سے صیغۂ مبالغہ ہے اور قطع نظر اس سے کہ فعلان کی ہیئت ترکیبی بصورت مبالغہ مستعمل ہو یا نہ ہو لفظ رحمٰن کے بارے میں یہ بات درست ہے کیونکہ لفظ "الرَّحْمٰنُ" کا استعمال تمام مواقع پر بطور مطلق اور کسی شرط کے بغیر ہوا ہے جو اس کے مفہوم کی عمومیت کو ظاہر کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کی رحمت تمام موجودات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس قول کی وضاحت یوں ہوتی ہے کہ کسی موقع پر یہ نہیں کہا گیا کہ "اِنَّ اللّٰہَ بِالنَّاسِ" یا بِالْمُؤْمِنِيْنَ لَرَحْمٰن خدا لوگوں پر یا مومنوں پر رحم کرنے والا ہے یعنی لفظ رحمٰن کو استعمال کرتے وقت اسے ناس یا مؤمنین یا کسی دوسرے لفظ یا شرط سے ہرگز مشروط نہیں کیا جاتا لیکن اس کے برعکس لفظ رحیم کا استعمال مشروط و مقید صورت میں ہوا ہے مثلاً اِنَّ اللّٰہَ بِالنَّاسِ "بِالْمُؤْمِنِيْنَ لَرَحِيْمٌ"

لفظ "رحمٰن" خدا کے لیے بمنزلہ لقب کے ہے اور اس کے علاوہ کسی اور کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض آیات میں اسے مستقل طور پر اور کسی دوسرے لفظ کا سہارا لیے بغیر خدا کے لیے استعمال کیا گیا ہے مثلاً:

قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَیْءٍ. [1]

(انہوں نے کہا کہ تم بھی بس ہمارے ہی جیسے آدمی ہو اور رحمٰن (خدا) نے تمہارے لیے کوئی چیز نہیں اتاری)۔

---

[1] سورہ یٰسین۔ آیت ۱۵

إِنْ يُرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ۔[1]

اگر رحمٰن (خدا) مجھے کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو نہ انکی سفارش میرے کسی کام آئے گی اور نہ وہ مجھے نجات دلا سکیں گے۔

هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ[2]

یہ وہی ہے جس کا رحمٰن (خدا) نے تم سے وعدہ کیا اور پیغمبروں نے بھی سچ کہا۔

مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۔[3]

تم رحمٰن (خدا) کی آفرنیش میں کوئی تفاوت نہیں پاؤ گے۔

وہ دلائل جو ہمارے اس قول کی تائید کرتے ہیں کہ رحمٰن خدا کا لقب ہے، ان میں سے ایک آیت یہ ہے۔

"وہ آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس کا پروردگار ہے۔ پس تم اسی کی عبادت کرو اور ثابت قدم رہو۔ کیا تمہارے علم میں اس کا کوئی ہم نام بھی ہے؟[4]"

آپ ملاحظہ کریں گے کہ خدا نے اس سورت (مریم) میں لفظ رحمٰن کو بہت پسند فرمایا اور اسے سولہ مرتبہ استعمال کیا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اس آیت میں یہ کہنے سے کہ خدا کا کوئی ہم نام نہیں، مراد رحمٰن ہے جو نام خدا کے لیے مخصوص ہے اور کسی دوسرے کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔

---

[1] سورۂ یٰسین ۔ آیت ۲۳ [2] سورۂ یٰسین ۔ آیت ۵۲

[3] سورۂ ملک ۔ آیت ۳ [4] سورۂ مریم ۔ آیت ۶۵

رحیم

یہ لفظ صفت مشبہ یا صیغہ مبالغہ ہے اور اس صیغے اور اس شکل فعیل کی خصوصیت اور وصف یہ ہے کہ یہ عموماً اس جبلت اور ان صفات کے لیے استعمال ہوتی ہے جو ذات سے جدا نہیں ہو سکتیں مثلاً علیم، قدیر، شریف، علی، سخی، وضیع، بخیل، دنی وغیرہ۔ پس ان دو صفات یعنی رحمٰن اور رحیم میں فرق یہ ہے کہ رحیم اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ رحمت، خدا کی ذات کے لوازم اور اس کی ہمیشہ رہنے والی اور کبھی جدا نہ ہونے والی صفات میں سے ہے اور "رحمٰن" فقط اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ خدا رحمت کی صفت کا مالک ہے۔

لفظ رحیم قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی اس چیز کے ساتھ آیا ہے جس سے اس کا تعلق ہے۔ ہمیشہ "با" کے ذریعے متعدی ہو گیا ہے مثلاً:

اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔[1]

(بے شک خدا لوگوں کے لیے بڑا شفیق اور مہربان ہے)۔

وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا[2]

(خدا ایمان والوں پر بڑا مہربان ہے)۔

گویا یہ لفظ (رحیم) ایسے مقام پر جہاں اس کا ذکر اس کے متعلق (بالناس - بالمؤمنین) کے ساتھ آیا ہے فعل متعدی کی بجائے فعل لازم کی شکل میں استعمال ہوا ہے کیونکہ اگر اسے لازم اور غیر متعدی فرض نہ کیا

---

[1] سورۂ بقرہ - آیت ۱۴۳ [2] سورۂ احزاب - آیت ۴۳

جانا تو "با" کے ذریعے متعدی نہ بنتا اور اس لفظ کا لازم قرار دیا جانا اس کے مفہوم کا جبلی اور فطری ہونا ثابت کرتا ہے جیسے کہ شریف اور وضیع۔

آلوسی نے ان دو الفاظ کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ صفتِ مشبّہ نہیں ہیں اور اس کی دلیل اس نے یہ دی ہے کہ یہ دونوں الفاظ رحمٰن الدنیا والآخرۃ ورحیمھما کے جملے میں مفعول کی جانب اضافہ ہوئے ہیں جبکہ صفتِ مشبہ فعل متعدی سے نہیں بلکہ فعل لازم سے بنائی جاتی ہے۔[1] دوسرے الفاظ میں صفت مشبّہ کا مفعول نہیں ہوتا۔ آلوسی کا یہ قول بڑا حیرت انگیز ہے کیونکہ مذکورہ بالا جملے میں یہ دو الفاظ یعنی رحمٰن اور رحیم اسکے مفعول کی جانب اضافے کے طور پر نہیں ہیں بلکہ مکان یا زمان کی جانب اضافے کے طور پر ہیں اور اس صورت میں متعدی اور لازم کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوتا۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ رحمٰن اسم خاص ہے اور اس کے معنی عام ہیں لیکن رحیم اسمِ عام ہے اور اس کے معنی خاص ہیں کیونکہ یہ آخرت یا مومنین سے مخصوص ہے۔[2] تاہم یا تو ان روایات کی تاویل کرنی چاہیے یا انہیں رد کر دینا چاہیے کیونکہ ظاہری طور پر یہ اللہ کی کتاب کے خلاف ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں لفظ رحیم مومنین یا آخرت سے مخصوص ہوئے بغیر استعمال ہوا ہے جس کے کچھ نمونے درج ذیل ہیں:

فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ[3]

جو کوئی میری متابعت کرتا ہے وہ تو مجھ سے ہے اور جو میری

---

[1] تفسیر آلوسی۔ جلد ۱۔ صفحہ ۵۹۔ [2] تفسیر طبری۔ جلد ۱۔ صفحہ ۴۳۔ تفسیر برہان جلد ۱۔ صفحہ ۲۸۔ [3] سورۂ ابراہیم۔ آیت ۳۶۔

نافرمانی کرتا ہے تو پھر تو ہی بخشنے والا اور مہربان ہے۔

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ [1]

(اے رسول!) میرے بندوں کو آگاہ کردو کہ میں بڑا بخشنے والا اور مہربان ہوں۔

اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ [2]

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ لوگوں پر بڑا شفیق اور مہربان ہے۔

رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا - [3]

تمہارا پروردگار وہ ہے جو تمہارے لیے سمندر میں جہاز چلاتا ہے تاکہ تم اس کی نعمتیں حاصل کرو کیونکہ وہ تم پر مہربان ہے۔

وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَاۗءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا [4]

وہ اگر چاہے تو منافقوں کو عذاب دے یا ان کی توبہ قبول کرے۔ بلاشبہ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ان آیتوں اور کئی ایک دوسری آیتوں میں جو یہاں نقل نہیں کی گئیں لفظ "رحیم" عام معنوں میں استعمال ہوا ہے اور کہا گیا ہے کہ خدا مومنوں، منافقوں اور تمام انسانوں پر دونوں جہان میں رحیم اور مہربان ہے۔

---

[1] سورۂ حجر۔ آیت ۴۹ [2] سورۂ حج۔ آیت ۶۵

[3] سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۶۶ [4] سورۂ احزاب۔ آیت ۲۴

بعض دعاؤں میں بھی آیا ہے کہ رحمٰن الدنیا والآخرۃ ورحیمہما اور ایسی دعاؤں میں رحمٰن اور رحیم ہر دو الفاظ ایک ہی مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ معنی کے عام اور خاص ہونے کے لحاظ سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جو روایات لفظ رحیم کو بلحاظ معنی خاص قرار دیتی ہیں اور انہیں فقط عالم آخرت سے مخصوص گردانتی ہیں ان کا مقصد شاید یہ ہے کہ اگر اللہ کی رحمت عالم آخرت تک جاری نہ رہے اور اسی دنیا میں منقطع ہو جائے تو اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے کیونکہ جس رحمت کے بعد انسان عذاب اور بدبختی میں مبتلا ہو جائے اس کا کوئی فائدہ نہیں اور جو رحمت زائل اور منقطع ہو جائے وہ دائمی عذاب میں تحلیل ہو کر محو ہو جائے گی۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ رحمت ایمان والوں یا روز قیامت اور آخرت سے مخصوص ہے۔

ایک ادبی وضاحت

بعض علمائے تفسیر کا خیال ہے کہ "بِسۡمِ اللّٰہِ" کا جار اور مجرور "اقول" یا "قُلۡ" یا "اِقۡرَاۡ" سے متعلق اور وابستہ ہے اور مفسرین کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ "بِسۡمِ اللّٰہِ" کا جار اور مجرور جملہ "اَسۡتَعِیۡنُ" یا "اِسۡتَعِنۡ" سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک تیسرا گروہ اسے "اَبۡتَدِاُ" سے متعلق بتاتا ہے۔

تاہم ہمارے خیال کے مطابق پہلے دو نظریے باطل اور غیر صحیح ہیں۔ جہاں تک پہلے نظریے کا تعلق ہے اس کے باطل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ قرأت یا قول کا مفعول ایک ایسا جملہ ہونا چاہیے جو مکمل معنیٰ رکھتا ہو۔ اس صورت میں ہم مجبور ہوں گے کہ خود ان الفاظ کے علاوہ ایک اور ایسا جملہ مہیا کریں جو قول یا

قرائت کا مفعول اور مفعول ہو جبکہ ایسا کرنا ایک اضافی اور بیجا عمل ہوگا۔

دوسرا نظریہ اس بنا پر باطل ہے کہ خود خدا کا استعانت اور مدد چاہنا محال ہے کیونکہ وہ اپنے اسمائے کریمہ تک سے مدد طلب کرنے سے بھی بے نیاز ہے اور لوگوں کو بھی خدا کے ناموں سے نہیں بلکہ خود خدا سے مدد مانگنی چاہیے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو "اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ" کے جملے میں بیان کی گئی ہے۔

پس اس بارے میں تیسرا نظریہ ہی بہتر ہے یعنی بِسۡمِ اللّٰہِ کا جار اور مجرور "اَبۡتَدِاُ" سے متعلق ہے۔

ایک اور نکتہ جس کا ذکر یہاں ضروری ہے وہ یہ ہے کہ "اللّٰہ" کے ساتھ لفظ "اسم" کا اضافہ، اضافۂ بیانیہ نہیں ہے تاکہ "اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ" سے مراد ان کلمات کے مجرد الفاظ ہوں نہ کہ ان کا مفہوم، کیونکہ اول تو یہ احتمال بعید معلوم ہوتا ہے اور دوم یہ کہ اگر اسم سے مراد ان تینوں الفاظ کا مجموعہ ہو تو وہ بصورتِ مجموعی خدا کا نام نہیں ہیں اور اگر وہ اکیلے اکیلے مراد ہوں تو اس صورت میں واوِ عاطفہ ان کے درمیان ضروری تھی تاکہ وہ انہیں ایک دوسرے سے جدا کر دیتی اور پھر یہ الفاظ یوں پڑھے جاتے: "بِسۡمِ اللّٰہِ وَالرَّحۡمٰنِ وَالرَّحِیۡمِ" لہٰذا یہ کہنا چاہیے کہ اللّٰہ کے ساتھ اسم کا اضافہ، اضافۂ معنوی ہے اور خود لفظ "اللّٰہ" سے بھی فقط یہ لفظ نہیں بلکہ اس کا مفہوم ہی مقصود ہے[1]

---

[1] آیت "بِسۡمِ اللّٰہِ ......" کی ادبی وضاحت کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ لفظ "اللّٰہ" کے ساتھ لفظ "اسم" کا اضافہ، اضافۂ معنوی ہے اور لفظ "اللّٰہ" بھی اپنے معنوں میں استعمال ہوا ہے اور اس سے مراد خود لفظ "اللّٰہ" نہیں ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے)

(پچھلے صفحہ سے آگے) لہٰذا یہ کہنا چاہیے کہ لفظ اِسْم اپنے عام اور جامع معنوں میں استعمال ہوا ہے جو خدا کے تمام ناموں پر مشتمل ہو سکتا ہے۔ پس "بِسْمِ اللّٰہ" کے الفاظ کہنے سے خدا کے نام کا مجموعی مفہوم مراد ہوتا ہے اور اشارے کا مصداق بن جاتا ہے چونکہ خدا کا اسمِ اعظم اس کے ناموں کا سب سے بڑا مصداق ہے، لہٰذا وہ اس کے مجموعی مفہوم سے بہتر اور زیادہ مطابقت رکھتا ہے اور لفظ اِسْم کہنے سے خدا کے دوسرے ناموں کے مقابلے میں کہنے اور سننے والے کے ذہن میں پہلے اور زیادہ رسائی حاصل کرتا ہے۔

اس وضاحت کے بعد اس روایت کے معنی صاف ہو جاتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ "آنکھ کی سیاہی اور سفیدی کی نزدیکی کے مقابلے میں بِسْمِ اللّٰہ خدا کے اسمِ اعظم سے زیادہ نزدیک ہے۔"

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسمِ اعظم سے جو کہ بِسْمِ اللّٰہ کے مفہوم کا حقیقی مصداق ہے۔ اس کا قرب اور نزدیکی فطری اور کامل ہے کیونکہ مصداق اور مفہوم بظاہر اور درحقیقت متحد اور ایک ہوتے ہیں لیکن آنکھ کی سیاہی کا اس کی سفیدی سے قرب، قرب مکانی اور ان کا اتحاد وضعی ہے یعنی یہ دونوں ذاتی اور حقیقی طور پر نہیں بلکہ وضع اور مکان کے لحاظ سے ایک دوسرے کے نزدیک ہیں اور قدرتی طور پر ذاتی قرب مکانی قرب سے زیادہ کامل اور بیشتر ہوتا ہے۔

پس مذکورہ بالا روایت کے معنی یہ ہوں گے کہ "بِسْمِ اللّٰہ" کہنے سے خدا کا اسمِ اعظم اس کے تمام دوسرے ناموں سے پہلے انسان کے ذہن میں پہنچتا ہے کیونکہ ناموں کا سب سے زیادہ برجستہ اور قریبی مصداق وہی ہے۔

قرآن کی سورتیں بسم اللہ سے کیوں شروع ہوتی ہیں؟

چونکہ قرآن مجید کی سورتیں اس لیے نازل ہوئی ہیں کہ وہ انسان کو اس کی امکانی نیک بختی کی آخری منزل تک پہنچا دیں اور اسے جہالت اور شرک کے اندھیرے سے نکال کر معرفت اور توحید کی جانب اس کی رہنمائی کریں لہٰذا مناسب یہی تھا کہ ہر سورت خدا کے پاکیزہ نام سے شروع ہو کیونکہ اس کا نام اس کی مقدس ذات کا پتا دیتا ہے اور قرآن مجید بھی انسان سے خدا کی ذاتِ اقدس کا تعارف کرانے کے لیے ہی نازل ہوا ہے۔

فقط سورۂ برائت اس قاعدے سے مستثنیٰ ہے اور وہ اس لیے کہ یہ سورت مشرکین سے علاحدگی اختیار کرنے کے مقصد سے نازل ہوئی ہے اور اس کی ابتدا بھی اسی انداز سے ہوتی ہے اس لیے یہ مناسب نہ تھا کہ اس کے شروع میں خدا کا نام ہوتا، بالخصوص جبکہ اس کا نام رحمٰن اور رحیم کے اوصاف کے ساتھ لیا جاتا ہے۔[1]

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا نے اپنی تدوینی کتاب (قرآن) کو اپنے

---

[1] ابن عباس نقل کرتے ہیں کہ امیرالمومنین علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ سورۂ برائت میں بِسْمِ اللّٰہ کیوں نہیں لکھی گئی؟ انھوں نے فرمایا: چونکہ بِسْمِ اللّٰہ امن کی دستاویز ہے اور سورۂ برائت میں امن کے تذکرے کا محل نہیں ہے اس لیے اس سورت کو بِسْمِ اللّٰہ کے بغیر لکھا گیا ہے۔ (مستدرک۔ جلد۲ صفحہ ۳۲۰)۔

نام کے ساتھ شروع فرمایا ہے جیسے کہ اس نے اپنی تکوینی کتاب (کائنات) کو اپنے سب سے بڑے اور سب سے کامل نام یعنی "حقیقتِ محمدؐیہ" اور حضرت محمدؐ کے معنوی وجود سے شروع کیا اور اسے دنیائے آفرینش کے تمام موجودات سے پہلے پیدا کیا ہے۔[1]

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے:

"اسم" اسے کہتے ہیں جو ذات پر دلالت کرے۔ اس بات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے خدا کے نام دو قسم کے ہیں — تکوینی اور وضعی — وضعی نام وہ ہیں جو چند حروف سے بنائے گئے ہیں تاکہ خدا کی ذاتِ اقدس یا اس کے جمال اور جلال کی صفات میں سے کسی ایک پر دلالت کریں لیکن تکوینی نام وہ موجودات اور مخلوقات ہیں جو اپنے وجود اور ہستی کے ذریعے سے اپنے خالق کے وجود، اس کی توحید اور بڑائی پر دلالت کرتے ہیں۔

"آیا یہ لوگ عدم اور نیستی سے پیدا ہوئے ہیں یا وہ خود ہی اپنے پیدا کرنے والے ہیں؟"[2]

---

[1] رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: پہلا مظہر جو خدا نے پیدا کیا اور اس سے دنیائے آفرینش کا آغاز کیا وہ میرا نور تھا۔ (بحار الانوار۔ جلد۱۔ صفحہ ۳۳)

محمد بن سنان روایت کرتے ہیں کہ میں امام محمد تقی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھا۔ انہوں نے مجھ سے فرمایا: اے محمد! جان لو کہ خدا اپنی یکتائی میں منفرد اور تنہا تھا، اس کے وجود کے علاوہ کسی اور چیز کا وجود نہ تھا۔ پھر اس نے محمدؐ اور علیؑ و فاطمہؑ کو پیدا کیا۔ وہ اپنے نور کی تخلیق کے بعد ہزار ادوار تک اسی حالت میں رہے۔ (اصول کافی۔ جلد۱۔ صفحہ ۲۳۹ ۔ وافی ۔ جلد۲ ۔ صفحہ ۱۵۵)۔

[2] سورۂ طور۔ آیت ۳۵۔

"اگر زمین و آسمان میں کئی ایک خدا ہوتے تو ان کا نظام فساد اور تباہی کی نذر ہو جاتا[1]"

ان آیتوں سے پتا چلتا ہے کہ ہر موجود اور مظہر خدا کے وجود اور اس کی توحید اور بڑائی پر ایک قسم کی دلالت کرتا ہے۔ اسی بنا پر انہیں کلمات یا خدا کے نام کہا جا سکتا ہے لیکن یہ لفظی نام نہیں بلکہ تکوینی نام ہیں۔

تاہم یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح خدا کے لفظی نام اس کی ذاتِ اقدس پر دلالت کے لحاظ سے مختلف اور متفاوت ہیں کیونکہ ان میں سے بعض اس کی ذات کی اصل اور اس کے تمام کمالات پر دلالت کرتے ہیں اور بعض اس کے کمالات کے ایک خاص پہلو پر دلالت کرتے ہیں اور ہر نام اپنے مفہوم کے اعتبار سے اس کے کمالات کی عظمت بیان کرتا ہے اسی طرح اس کے تکوینی نام بھی (موجودات) جو اس کے وجود، توحید، علم، قدرت اور دوسری کمالی صفات کے اظہار میں مشترک ہیں لیکن اس کی بڑائی اور کمالات پر دلالت میں قوت اور وسعت کے لحاظ سے متفاوت ہیں۔

اس اختلاف اور تفاوت کی بنیاد یہ ہے کہ موجود جتنا زیادہ کامل اور شائستہ ہو خدا کے وجود اور عظمت پر اس کی دلالت اتنی ہی زیادہ قوی ہو جاتی ہے۔ اسی بنا پر کچھ روایات میں آیا ہے کہ ائمہ ہُدیٰ پر اسمائے حسنیٰ کا اطلاق صحیح اور پر معنی ہے[2]

---

[1] سورۂ انبیاء - آیت ۲۲ [2] کافی - توحید کے ابواب میں سے باب نوادر (صفحہ ۷۰) - وافی جلد ۱ (صفحہ ۱۰۶) - تفسیر برہان - جلد ۱ (صفحہ ۳۷۷)۔

پس خداوند متعال نے اپنی کامل ترین تدوینی کتاب (قرآن)، کو معززترین الفاظ سے شروع کیا ہے جو اس کے اسمِ اعظم کے قریب اور نزدیک ہیں — اتنے نزدیک کہ آنکھ کی سیاہی اور سفیدی بھی باہم اتنی نزدیک نہیں ہیں۔[1]

یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ اس نے اپنی تکوینی کتاب کو اپنی بڑائی اور قدرت کی سب سے بڑی نشانی کے ساتھ اور جہانِ ہستی کے سب سے بڑے ناموں اور موجودات کے ساتھ جو کہ نور محمدؐ ہی ہے شروع فرمایا ہے اور چاہا ہے کہ اس حساس اور سبق آموز عمل کے ذریعے لوگوں کو یہ بتائے کہ وہ بھی اپنے اقوال اور افعال کی ابتدا خدائے بزرگ کے نام سے کریں جیسے کہ خود اس نے اپنی تدوینی کتاب کو سب سے بڑے لفظی ناموں کیساتھ اور اپنی تکوینی کتاب کو سب سے بڑے تکوینی ناموں سے شروع کیا ہے۔

رسول اکرمؐ سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا: جو قول اور جو اہم کام خدا کے نام کے ساتھ شروع نہ کیا جائے وہ "ابتر" بے نتیجہ یا "اقطع" اور ناقص ہو گا۔[2]

امیرالمومنین علیؑ بھی رسول اکرمؐ سے نقل کرتے ہیں کہ ہر وہ اہم کام جو خدا کے نام سے نہ شروع کیا جائے وہ ناقص اور بے نتیجہ ہو گا۔[3]

---

[1] وافی۔ جلد ۵۔ صفحہ ۹۹ ۔ تہذیب۔ جلد ۱۔ صفحہ ۲۱۸۔ مستدرک حاکم۔ جلد ۱۔ صفحہ ۵۵۲۔ کنز العمال۔ جلد ۲۔ صفحہ ۱۹۰۔ عثمان نے بھی یہ روایت الفاظ کے معمولی تفاوت کے ساتھ رسول اکرمؐ سے نقل کی ہے۔ [2] مسند احمد بن حنبل۔ جلد ۲۔ صفحہ ۳۵۹۔

[3] بحار الانوار۔ جلد ۱۶۔ باب ۵۸ اور جلد ۱۹۔ صفحہ ۶۰۔

آیۂ بسم اللہ کی تشریح

قرآن کی ابتدا رحمت کی صفت کے ساتھ

بزرگ اور مہربان پروردگار نے اپنے کلام کی ابتدا میں اپنی تعریف، رحمت اور رحمانیت کے ساتھ کی ہے اور اپنی تمام کمالی صفات میں سے فقط اس صفت کا انتخاب فرمایا ہے اور یہ خدا کی صفت رحمت ہی ہے جو اس بات کا موجب بنی کہ وہ اپنے پیغمبرؐ کو لوگوں کی جانب بھیجے اور ان پر قرآن نازل کرے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی ابتدا خدا کی رحمانیت کے ساتھ ہوئی اور اس کتاب کا آغاز رحمت کی صفت کے ساتھ ہوا۔

بلاشبہ قرآن کتابِ رحمت ہے اور اس کا لانے والا پیامبرِ رحمت ہے۔

خدا نے متعدد آیات میں اس حقیقت کی تصریح فرمائی ہے اور قرآن اور پیغمبرؐ کی تعریف رحمت کی صفت کے ساتھ کی ہے:

"یہ قرآن تمہارے پروردگار کی طرف سے روشن دلیلیں لایا ہے اور ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت کا ذریعہ ہے[1]۔"

"یہ قرآن دلوں کے لیے شفا اور ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے[2]۔"

"ہم نے تم پر کتاب نازل کی جس میں ہر چیز کا شافی بیان ہے اور یہ مسلمانوں کے لیے ہدایت، رحمت اور خوشخبری ہے[3]۔"

"ہم قرآن میں وہی چیز نازل کرتے ہیں جو ایمان والوں کے لیے شفا اور رحمت ہے[4]۔"

"ہم نے تمہیں دنیا کے تمام لوگوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے[5]۔"

"بلاشبہ یہ (قرآن) ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے[6]۔"

رحمٰن کے بعد رحیم

ہم گزشتہ صفحات میں کہہ چکے ہیں کہ جو مادہ اور لفظ فَعِیلٌ کے

---

[1] سورۂ اعراف۔ آیت ۲۰۳ [2] سورۂ یونس۔ آیت ۵۷

[3] سورۂ نحل۔ آیت ۸۹ [4] سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۸۲

[5] سورۂ انبیاء۔ آیت ۱۰۷ [6] سورۂ نمل۔ آیت ۷۷

وزن پر ہو وہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس مادے سے وجود میں آنے والے لفظ کا اصلی مفہوم دائمی جبلتیں اور صفات ہیں جو ذات سے جدا نہیں ہو سکتیں مثلاً شریف اور بخیل۔

اس بیان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ لفظ "رحیم" جو "فعیل" کے وزن پر ہے رحمٰن کے بعد کیوں آیا ہے۔ اگرچہ اسم "رحمٰن" کی وضع رحمت کی وسعت اور عمومیت پر دلالت کرتی ہے لیکن اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ یہ صفت ذات کے لوازم میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رحمٰن کے ذکر کے بعد رحیم لایا گیا ہے تاکہ اس مفہوم پر دلالت اور اشارہ ہو۔ یوں اس مختصر آیت سے دونوں مقاصد حاصل ہوتے ہیں یعنی خدا رحمٰن ہے کہ اس کی رحمت وسیع اور ہر چیز پر محیط ہے اور وہ رحیم بھی ہے کیونکہ اس کی رحمت اس کی ذات سے الگ نہیں ہو سکتی۔

بعض مفسرین نے اس علمی اور ادبی نکتے پر توجہ نہیں دی کہ لفظ رحمٰن رحمت کی وسعت اور لفظ رحیم اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ رحمت خدا کی ذات سے الگ نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے رحمٰن اور رحیم کے باہمی فرق کے بارے میں دوسرا راستہ اختیار کیا اور یہ تصور کیا ہے کہ معنی کے لحاظ سے لفظ "رحمٰن" لفظ "رحیم" سے زیادہ وسیع ہے اور اس قول کی وضاحت یوں کی ہے کہ حروف کی زیادتی معنوں کی زیادتی اور وسعت پر دلالت کرتی ہے۔

لیکن یہ دلیل مضحکہ خیز ہے کیونکہ الفاظ کی دلالت ان کی وضع اور ان کی ساخت کے تابع ہوتی ہے اور اس کا حروف کی کمی یا زیادتی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اکثر ایسے الفاظ ہوتے ہیں جن کے حروف کم اور معنی زیادہ ہوتے ہیں

لیکن مفہوم اور معنی کے لحاظ سے ان کی وسعت کم ہوتی ہے مثلاً لفظ "حذر" جو فعل کے وزن پر ہے زیادتی میں مبالغے پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اس کے معنی بہت ڈرپوک کے ہیں لیکن لفظ حاذِر میں یہ مبالغہ اور زیادتی موجود نہیں حالانکہ اس میں لفظ "حذر" سے ایک حرف زیادہ ہے اور اکثر ایسے الفاظ بھی ہوتے ہیں جن کے "مجرد" اور "مزید فیہ" دونوں کے ایک ہی معنی ہوتے ہیں۔ مثلاً ضرّ اور أضرّ جو دونوں ضرر کے معنی میں ہیں۔

جو کچھ ہم نے لفظ رحیم کو لفظ رحمٰن کے بعد لانے کے متعلق کہا ہے وہ اس ضمن میں ہے جب رحمٰن اپنے اشتقاقی اور لغوی معنوں میں استعمال ہو لیکن اگر وہ اپنے اسمی معنوں اور خدا کے خاص لقب کی شکل میں استعمال ہو تو اس صورت میں بحث کا رُخ بدل جاتا ہے۔ چنانچہ جو کچھ پہلے کہا گیا ہے اس کے علاوہ رحمٰن کے بعد لفظ "رحیم" اس لیے لایا گیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ "رحمٰن" کا لغوی معنی کے لحاظ سے استعمال کرنے اور اسے پروردگار کا خاص لقب قرار دینے کا سبب یہی ہے کہ وہ وسیع رحمت اور مہربانی کی صفت رکھتا ہے۔

کیا "بِسْمِ اللّٰہ" قرآن کا حصّہ ہے؟

شیعہ امامیہ میں اس امر پہ اتفاق ہے کہ قرآن مجید کی ہر وہ سورت جو بِسْمِ اللّٰہ سے شروع ہو۔ بِسْمِ اللّٰہ اس سورت کا ایک حصہ اور اس کی آیتوں میں سے ایک آیت ہوتی ہے اور وہ ان میں سے ہر سورت کے

ساتھ نازل ہوئی ہے۔

ابن عباس اور ابن مبارک اور اہل مکہ مثلاً ابن کثیر اور کوفی علماء مثلاً عاصم اور کسائی وغیرہ کا بجز حمزہ کے یہی نظریہ تھا۔ بہت سے شافعی حضرات کا بھی یہی نظریہ رہا ہے۔[1] نیز مکہ اور کوفہ کے قاریوں نے بھی بسم اللہ کے جزوِ قرآن ہونے کو قطعی اور مسلم گردانا ہے۔[2]

یہ نظریہ عبداللہ ابن عمر، ابن زبیر، ابو ہریرہ، عطا، طاؤس، سعید بن جبیر، مکحول، زہری سے اور بہ روایتے احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور ابو عبید قاسم بن سلام سے بھی نقل کیا گیا ہے۔[3] مزید برآں بیہقی نے اس نظریے کو ثوری اور محمد بن کعب سے بھی نقل کیا ہے۔[4]

فخر الدین رازی نے بھی اپنی تفسیر میں یہی نظریہ اختیار کیا ہے اور اسے مکہ و کوفہ کے قاریوں اور حجاز کے بیشتر فقہاء کے علاوہ ابن مبارک اور ثوری سے منسوب کیا ہے۔ جلال الدین سیوطی نے بھی یہی نظریہ اپنایا ہے اور کہا ہے کہ اس بارے میں روایات معنوی تواتر رکھتی ہیں۔[5]

لیکن حمزہ اور بعض شافعی حضرات نے کہا ہے کہ "بسم اللہ" فقط سورۂ حمد کا جزو ہے اور دوسری سورتوں کا جزو نہیں ہے۔ یہ نظریہ احمد بن حنبل سے بھی منسوب کیا گیا ہے جیسے کہ بعض ناقلین نے پہلا نظریہ ان سے

---

[1] تفسیر آلوسی۔ جلد ۱۔ صفحہ ۳۹ [2] تفسیر شوکانی۔ جلد ۱۔ صفحہ ۷

[3] تفسیر ابن کثیر، جلد ۱۔ صفحہ ۱۶ [4] تفسیر خازن۔ جلد ۱۔ صفحہ ۱۳

[5] اتقان جلد ۱۔ صفحات ۱۳۵ - ۱۳۶ - نوع ۲۲ تا ۲۷

منسوب کیا ہے۔[1]

اس بارے میں ایک تیسرا نظریہ بھی ہے۔ مالک، ابوعمرو اور یعقوب جیسے علماء کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ بِسْمِ اللّٰہ ایک مستقل آیت ہے اور قرآن مجید کی کسی سورت حتیٰ کہ سورۂ حمد کا جزو بھی نہیں ہے۔ تاہم یہ آیت قرآن مجید کی سورتوں کے آغاز میں برکت کی خاطر اور ان سورتوں کو ایک دوسری سے جدا ظاہر کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے اور یہ کسی سورت کا جزو نہیں ہے۔

اس نظریے کو حنفیوں میں بہت شہرت حاصل ہے لیکن ان میں سے اکثر یہ نظریہ رکھنے کے باوجود نماز میں سورۂ حمد سے پہلے "بِسْمِ اللّٰہ" کی تلاوت مستقل طور پر واجب سمجھتے ہیں جیسا کہ زاہدی نے مجتبیٰ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ صحیح نقل کے مطابق ابوحنیفہ نماز کی تمام رکعتوں میں بِسْمِ اللّٰہ کا پڑھنا واجب سمجھتے تھے۔[2]

مالک کے عقیدے کے مطابق نماز میں بِسْمِ اللّٰہ پڑھنا بجائے خود مکروہ ہے لیکن اتحاد قائم رکھنے اور ان علماء کے خیالات اور آراء کی مخالفت نہ کرنے کی خاطر جو اس کا نماز میں پڑھنا واجب سمجھتے ہیں انہوں نے اس کا پڑھنا اچھا اور مستحسن گردانا ہے۔[3]

صحیح نظریہ اور اس کے بارے میں دلائل

بلاشبہ اس مسئلے کے بارے میں اور نظریات بھی ہیں جو نادر اور

[1] اور [2] تفسیر آلوسی۔ جلد ا صفحہ ۳۹ [3] الفقہ علی المذاہب الاربعہ۔ جلد ا صفحہ ۲۵۷

غیر معروف ہیں اور انہیں نقل کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے یہاں فقط ان تین نظریات کا ذکر کیا ہے جو اہم اور معروف ہیں۔ ان میں سے صحیح نظریہ یہی ہے کہ "بِسۡمِ اللّٰہ" قرآن کی تمام سورتوں کا جزو اور ان میں سے ہر سورت کی ایک آیت ہے ماسوائے سورۂ توبہ کے جو نازل ہی "بِسۡمِ اللّٰہ" کے بغیر ہوئی ہے۔

ہمارے پاس اس نظریے کو ثابت کرنے کے لیے جس پر تمام شیعہ علماء کا اتفاق ہے کافی دلائل موجود ہیں جن میں سے چند ایک ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

۱۔ اہلِ بیتؑ کی روایات

رسولِ اکرمؐ کے اہلِ بیت سے بکثرت صحیح روایات ہم تک پہنچی ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ "بِسۡمِ اللّٰہ" قرآن کی سورتوں کا جزو ہے[1] یہی روایات اس نظریے کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں اور ہمیں دوسرے دلائل سے بے نیاز کر دیتی ہیں کیونکہ رسول اکرمؐ نے اپنے اہل بیتؑ کو قرآن مجید کا ہم پلہ اور ہمدوش قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ ہر قسم کے دینی مسائل اور مشکلات میں ان سے رجوع کرنا چاہیے اور انہیں حل کرنے میں ان سے مدد لینی چاہیے۔ ان میں سے چند روایات حسب ذیل ہیں:

---

[1] روایات کے اس سلسلے کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے کتاب فروع کافی باب قرائت قرآن صفحہ ۸۶۔ استبصار جلد ۱ صفحہ ۳۱۱۔ تہذیب جلد ۱ صفحات ۱۵۳ تا ۲۱۸ اور وسائل الشیعہ جلد ۱ صفحہ ۳۵۲ سے رجوع فرمائیں۔

(ا) معاویہ بن عمار بیان کرتے ہیں: میں نے امام صادق علیہ السلام سے عرض کیا: جب میں نماز میں کھڑا ہوں تو کیا سورۂ حمد میں "بِسۡمِ اللّٰہ" پڑھوں؟
امام نے فرمایا: ہاں۔
میں نے عرض کیا: جب میں سورۂ حمد کے بعد نماز میں دوسری سورت پڑھوں تو کیا اس کے ساتھ بھی بِسۡمِ اللّٰہ پڑھوں؟
آپ نے فرمایا: ہاں[1]
(ب) یحییٰ بن عمران ہمدانی کہتا ہے: میں نے امام باقرؑ کو لکھا: میں آپ پر فدا ہو جاؤں، اگر کوئی شخص نماز میں سورۂ حمد بِسۡمِ اللّٰہ کے ساتھ پڑھے لیکن جب دوسری سورت پر پہنچے تو بِسۡمِ اللّٰہ کو ترک کر دے تو اس بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ اور میں نے اپنے خط میں اس جملے کا اضافہ بھی کیا کہ عباسی اس بارے میں کہتا ہے کہ "کوئی حرج نہیں" اس کے متعلق آپ کا نظریہ کیا ہے؟
امامؑ نے اپنے قلم سے لکھا: "یُعِیۡدُ ھَا" یعنی اسے چاہیے کہ نماز دوبارہ پڑھے۔
عباسی کا دماغ درست کرنے کے لیے آپ نے یہ جملہ دو مرتبہ لکھا تھا۔[2]
(ج) صحیحۂ ابن اذینہ میں لکھا ہے کہ ..... جب رسولِ اکرمؐ تکبیر اور نماز کے ابتدائی آداب سے فارغ ہوئے تو خدا نے ان پر وحی نازل کی کہ مجھے میرے نام سے یاد کرو۔ یہی وجہ تھی کہ بِسۡمِ اللّٰہ پہلی سورت میں رکھی گئی۔ پھر خدا نے وحی فرمائی کہ میری حمد بیان کرو۔ جب آپ

---

[1] اور [2] کافی۔ جلد ۳ صفحہ ۳۱۲۔ مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ۔ تہران۔

نے "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" کا جملہ زبان سے ادا کیا تو دل میں کہا: شکراً۔ اس موقع پر خدا نے آپ پر پھر وحی نازل کی کہ تم نے میری حمد کو قطع کر دیا ہے۔ پس دوبارہ مجھے میرے نام کے ساتھ یاد کرو۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ حمد میں "الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" دو دفعہ پڑھا جاتا ہے اور جب رسول اکرمؐ "وَلَا الضَّآلِّیْنَ" پر پہنچے تو آپ نے بطور شکر کہا: "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ"

یہاں پھر خدا نے وحی نازل کی کہ میرا جو نام تم نے لیا ہے اسے قطع کر دیا ہے۔ ایک دفعہ پھر میرا نام لو چنانچہ رسولِ اکرمؐ نے اس حکم کے مطابق ایک دفعہ پھر بِسْمِ اللّٰہ پڑھی۔

یہی وجہ ہے کہ جو سورت نماز میں حمد کے بعد پڑھی جاتی ہے اس کے شروع میں بِسْمِ اللّٰہ رکھی گئی ہے۔

پھر خدا نے فرمایا کہ:

اے محمدؐ! وہ چیز پڑھو جو تمہارے پروردگار کے اوصاف اور حقیقت کو بیان کرتی ہے۔ کہو قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ○ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ○ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ○ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ○[1]

اہلِ سنت کی روایات

اہلِ سنت کے طریقے سے بھی بہت سی روایات نقل کی گئی ہیں جو "بِسْمِ اللّٰہ" کے تمام سورتوں کا جزو ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ ان روایات

---

[1] کافی۔ جلد ۳۔ صفحہ ۳۱۲۔

میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

(ا) انس کہتے ہیں: ایک دن جب رسول اکرمؐ ہمارے درمیان بیٹھے ہوئے تھے خفیف نیند سے ملتی جلتی ہلکی سی غشی آپ پر طاری ہوگئی۔ بعد میں انہوں نے مسکراتے ہوئے اپنا سر بلند کیا۔ ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ کے تبسم فرمانے کی کیا وجہ ہے؟

آپ نے فرمایا: ابھی ابھی مجھ پر ایک سورت نازل ہوئی ہے۔ پھر آپ نے پڑھا "بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۔ اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ ....."[1]

(ب) دارقطنی نے صحیح سند کے ساتھ لکھا ہے کہ امیرالمومنین امام علیؑ سے "سبع مثانی" کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ آپ نے فرمایا: "سبع مثانی" سورۂ حمد ہے۔

پھر کہا گیا کہ اس سورت کی تو فقط چھ آیتیں ہیں۔

آپ نے فرمایا: بِسۡمِ اللّٰہِ بھی ایک آیت ہے۔[2]

(ج) پھر دارقطنی نے صحیح سند کے ساتھ ابوہریرہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: جب سورۂ حمد پڑھو تو بِسۡمِ اللّٰہِ بھی پڑھو کیونکہ یہ سورت قرآن کی بنیاد، ام الکتاب اور سبع مثانی ہے اور بِسۡمِ اللّٰہِ بھی اس سورت کی آیتوں میں سے ایک آیت ہے۔[3]

---

[1] صحیح مسلم۔ جلد۲۔ صفحہ ۱۲، سنن نسائی جلد ا صفحہ ۱۴۳، سنن ابوداؤد۔ جلد ا صفحہ ۱۳۵۔ [2] اور [3] اتقان جلد ا۔ صفحہ ۱۳۶۔ نوع ۲۲ تا ۲۷ —— یہ دو حدیثیں بیہقی نے بھی اپنی سنن میں جلد۲۔ صفحہ ۴۵ پر نقل کی ہیں۔

(د) ابن خزیمہ اور بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ ابن عباس سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: سبع مثانی سورۂ حمد ہے۔ ان سے دریافت کیا گیا کہ ساتویں آیت کونسی ہے؟ انہوں نے جواب دیا "بِسْمِ اللّٰہ"۔[1]

(ہ) ابن خزیمہ نے اور بیہقی نے "المعرفۃ" میں بھی یہ روایت سعید بن جبیر کے طریق سے ابن عباس سے نقل کی ہے کہ شیطان نے لوگوں کے درمیان سے سب سے بڑی آیت "بِسْمِ اللّٰہ" چرالی ہے۔[2]

(و) سعید بن جبیر نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ مسلمان کسی سورت کو اس وقت تک مکمل نہیں سمجھتے تھے جب تک کہ آیہ بِسْمِ اللّٰہ دوبارہ نازل نہیں ہوتی تھی اور جب یہ آیت نازل ہو جاتی تھی تو وہ سمجھ لیتے تھے کہ سورت مکمل ہو گئی ہے۔[3]

(ز) سعید بن جبیر نے ابن عباس سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ جب جبرئیل رسول اکرمؐ پر نازل ہوتے تھے اور بِسْمِ اللّٰہِ پڑھتے تھے تو آنحضرتؐ سمجھ جاتے تھے کہ ایک نئی سورت شروع ہو رہی ہے۔[4]

(ح) ابن جریح ناقل ہیں کہ میرے باپ نے کہا: "سعید بن جبیر نے مجھ

---

[1] اتقان۔ جلد ۱۔ صفحہ ۱۳۶۔ نوع ۲۲ تا ۲۷ سنن بیہقی جلد ۲۔ صفحہ ۴۵۔ مستدرک حاکم جلد ۱۔ صفحہ ۵۵۱۔

[2] اتقان۔ جلد ۱۔ صفحہ ۱۳۶۔ نوع ۲۲۔۲۷ سنن بیہقی جلد ۲۔ صفحہ ۵۰

[3] مستدرک حاکم جلد ۱۔ صفحہ ۲۳۲۔ حاکم نے اس حدیث کے بارے میں کہا ہے کہ شیخین (بخاری اور مسلم) کی شرط کے مطابق یہ صحیح ہے۔

[4] مستدرک حاکم۔ جلد ۱۔ صفحہ ۲۳۱

سے بیان کیا کہ آیت "وَلَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ" سے مراد "ام القرآن سورۂ حمد ہے"۔ ابن جریح ناقل ہیں: میرے باپ نے مزید کہا کہ سعید بن جبیر نے میرے سامنے بِسْمِ اللّٰہ بطور ساتویں آیت کے پڑھی اور پھر کہا: جس طرح میں بِسْمِ اللّٰہ تمہارے لیے ساتویں آیت کے طور پر پڑھ رہا ہوں، اسی طرح ابن عباس نے یہ میرے لیے بطور ساتویں آیت کے پڑھی اور کہا: خدا نے یہ سورت تم مسلمانوں کے لیے بھیجی ہے اور تم سے پہلے اس نے ایسی سورت کسی قوم کے لیے نہیں بھیجی۔[1]

مخالف روایات

ان تمام روایات کے مقابلے میں جو بِسْمِ اللّٰہ کے قرآن مجید کی سورتوں کا حصہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں فقط دو روایتیں ایسی ہیں جو اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ بِسْمِ اللّٰہ قرآن کی سورتوں کا حصہ نہیں ہے:

(۱) قتادہ نے انس بن مالک سے نقل کیا ہے کہ میں نے رسول اکرمؐ کے ساتھ اور ابوبکر، عمر اور عثمان کے ساتھ نماز پڑھی اور ان میں سے کسی کو نماز میں بِسْمِ اللّٰہ کی قرائت کرتے نہیں سنا۔[2]

---

[1] مستدرک حاکم۔ جلد ا صفحہ ۲۳۱، کتاب فضائل القرآن۔ صفحہ ۵۵۰

[2] مسند احمد۔ جلد ۳۔ صفحات ۱۷۷ اور ۲۷۳ تا ۲۷۸۔ صحیح مسلم۔ جلد ۲۔ صفحہ ۱۳۔ سنن نسائی۔ جلد ا۔ صفحہ ۱۴۴۔ عبداللہ بن مغفل سے بھی اس سے ملتی جلتی روایت نقل کی گئی ہے۔

(۲) یزید بن عبد اللہ بن مغفل کہتا ہے: میں نے بِسْمِ اللّٰہ پڑھی اور میرے باپ نے سن لیا اور کہا: میرے بیٹے! بِسْمِ اللّٰہ پڑھنے سے باز رہو۔ پھر میرے باپ نے یوں وضاحت کی: میں نے رسولِ خداؐ کے تمام اصحاب کے درمیان بِسْمِ اللّٰہ پڑھنے سے بدتر بدعت نہیں دیکھی اور میں نے رسول اکرمؐ ابوبکر، عمر اور عثمان کے ساتھ نماز پڑھی ہے اور ان میں سے کسی کو بھی بِسْمِ اللّٰہ پڑھتے نہیں سنا۔ اس لیے جب بھی تم نماز پڑھو تو بس "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" ہی پڑھا کرو۔[۱]

پہلی روایت کا جواب

قطع نظر اس سے کہ یہ روایت ان روایتوں کے خلاف ہے جو اہلبیتؑ سے نقل کی گئی ہیں، تاہم بعض دوسری وجوہ کی بنا پر بھی یہ قابل اعتماد نہیں ہے کیونکہ:

(۱) یہ روایت ان بہت سی روایات کے خلاف ہے جو اہل سنت کی جانب سے معنوی تواتر کے ساتھ نقل کی گئی ہیں اور ان میں کچھ ایسی روایات بھی ہیں جو سند کے لحاظ سے صحیح ہیں۔ نیز ابن عباسؓ، ابوہریرہؓ اور ام سلمہ نے شہادت دی ہے کہ رسول اکرمؐ بِسْمِ اللّٰہ پڑھا کرتے تھے اور اسے سورۂ حمد کی ایک آیت شمار کرتے تھے۔ ابن عمر نے کہا ہے: "اگر یہ مان لیا جائے کہ بسم اللہ نہیں پڑھنی چاہیے تو یہ

---

[۱] مسند احمد۔ جلد ۴۔ صفحہ ۸۵۔ ترمذی نے بھی یہ حدیث معمولی اختلاف کے ساتھ نقل کی ہے۔ صحیح ترمذی۔ جلد ۲۔ صفحہ ۴۳۔

قرآن مجید میں کیوں لکھی گئی ہے؟"

امام علی علیہ السلام نے بھی فرمایا ہے: "جو شخص بسم اللہ کو ترک کرے وہ قرآن کی سورت میں کمی کرتا ہے" اور یہ بھی فرمایا ہے کہ: بِسْمِ اللّٰہ سبع مثانی (سورۂ حمد) کا تتمہ اور اسے مکمل کرنے والی ہے[1]۔"

---

[1] مزید وضاحت کے لیے مندرجہ ذیل احادیث ملاحظہ کریں:

بیہقی نے نقل کیا ہے کہ ام سلمہ فرماتی ہیں: رسول اکرمؐ نے نماز میں بِسْمِ اللّٰہ پڑھی اور اسے ایک مستقل آیت قرار دیا۔ حاکم نے یہ روایت مستدرک میں نقل کی ہے اور کہا ہے کہ یہ شیخین کی شرائط کے ساتھ صحیح ہے۔ مستدرک۔ جلد ا۔ صفحہ ۲۳۲۔

بیہقی نے عبد الخیر سے بھی نقل کیا ہے کہ امام علی علیہ السلام نے رسولِ اکرمؐ سے "سبع مثانی" کے بارے میں پوچھا۔ آنحضرتؐ نے جواب دیا کہ "سبع مثانی" سورۂ حمد ہے۔ حاضرین نے کہا: یا رسول اللہؐ! سورۂ حمد کی تو چھ آیتیں ہیں، سات نہیں۔ آپ نے فرمایا: "بِسْمِ اللّٰہ....." بھی اس کی ایک آیت ہے۔ یہ روایت بیہقی نے ابوہریرہ سے بھی نقل کی ہے۔

بیہقی نے ابو ہریرہ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ رسول اکرمؐ فرماتے تھے: سورۂ حمد کی سات آیتیں ہیں اور ان میں سے ایک آیت بِسْمِ اللّٰہ ہے۔

بیہقی نے ابن عباس سے یوں نقل کیا ہے: "رسول اکرمؐ سورۂ حمد کو ہمیشہ بِسْمِ اللّٰہ کے ساتھ شروع فرماتے تھے۔

یہ روایت ترمذی نے بھی اپنی صحیح (جلد ۲۔ صفحہ ۴۴) میں نقل کی ہے۔

بیہقی نے ابن عمر سے بھی نقل کیا ہے کہ وہ نماز کی ابتدا تکبیر سے کرتے تھے اور اس کے بعد بِسْمِ اللّٰہ سے شروع کر کے سورۂ حمد کے آخر تک پڑھتے تھے (باقی اگلے صفحہ پر)

اس صورت میں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم ان تمام روایات، بزرگ محدثین اور اصحاب رسولؐ کی روایتوں اور شہادتوں کو نظر انداز کر دیں اور فقط اس روایت کو قبول کریں کہ جس کے مطابق بِسۡمِ اللّٰہ قرآن مجید کی سورتوں کا حصہ نہیں ہے۔

(۲) یہ روایت اس طریقے کے خلاف ہے جو مسلمانوں میں عملی طور پر رائج اور معروف ہے کیونکہ مسلمان عموماً نمازیں بِسۡمِ اللّٰہ پڑھتے رہے ہیں حتیٰ کہ معاویہ نے اپنی خلافت کے دوران میں ایک دفعہ بِسۡمِ اللّٰہ ترک کی تو مسلمانوں نے اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ تم نے بِسۡمِ اللّٰہ چرا لیا ہے یا اسے بھول گئے ہو؟[1]

(پچھلے صفحے سے آگے) اور سورۂ حمد کے بعد دوسری سورت بھی بِسۡمِ اللّٰہ سے شروع کرتے تھے لیکن اس عمل کی وجہ یہ بتاتے تھے کہ اگر "بِسۡمِ اللّٰہ ......" کا پڑھنا ضروری نہ ہوتا تو یہ قرآن میں نہ لکھی جاتی۔

اس موضوع پر روایات کے یہ چند نمونے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی ایسی روایات موجود ہیں۔ مزید معلومات کے لیے ملاحظہ ہو سنن بیہقی۔ جلد ۲۔ صفحات ۴۳ تا ۴۷۔

کنز العمال (جلد ۲۔ صفحات ۱۹۰ اور ۳۷۵) میں ثعلبی سے روایت ہے: امام علیؑ نماز میں جو سورہ تلاوت کرتے تھے اسے بِسۡمِ اللّٰہ سے شروع کرتے تھے اور فرماتے تھے جو شخص یہ آیت نہ پڑھے وہ سورت میں کمی کرتا ہے۔ آپ یہ بھی فرماتے تھے کہ "بِسۡمِ اللّٰہ ......" کی آیت "سبع مثانی" کی تکمیل کرتی ہے یعنی بِسۡمِ اللّٰہ کے ساتھ سورۂ حمد کی سات آیتیں مکمل ہو جاتی ہیں اور "سبع مثانی" کہلاتی ہیں۔

[1] بیہقی نے انس بن مالک سے روایت کی ہے کہ معاویہ نے مدینہ (باقی اگلے صفحہ پر)

اس صورت میں یہ کیونکر تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ رسول اکرمؐ اور خلفاء بِسْمِ اللّٰہ نہیں پڑھتے تھے۔

(۳۱) یہ روایت خود انس ہی سے منقول ایک مشہور روایت کے خلاف ہے۔[۱]

(پچھلے صفحے سے آگے) میں نماز پڑھائی اور اس نماز میں سورۂ حمد کے ساتھ تو بِسْمِ اللّٰہ... پڑھی لیکن دوسری سورتوں کے ساتھ جو سورۂ حمد کے بعد پڑھی جاتی ہیں "بِسْمِ اللّٰہ..... کی قرائت نہیں کی اور پھر جب سورت ختم ہوگئی تو رکوع کے بعد تکبیر کہے بغیر ہی سجدہ میں چلا گیا اور اسی طرح نماز کو تمام کیا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوا تو مہاجرین میں سے چند افراد جو وہاں موجود تھے اور یہ واقعہ دیکھ رہے تھے، انہوں نے ہر طرف سے آواز بلند کی کہ اے معاویہ! تم نے نماز چُرا لی ہے یا بھول گئے ہو؟ مسلمانوں کے اس اعتراض کے نتیجے میں معاویہ نے بعد کی نمازوں میں ہر سورت سے پہلے بِسْمِ اللّٰہ پڑھی اور سجدہ میں جاتے وقت تکبیر بھی کہی (سنن بیہقی۔ جلد۲۔ صفحہ ۴۹)۔

یہ روایت بیہقی نے ایک اور طریقے سے بھی نقل کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ معاویہ نے نہ سورۂ حمد کے ساتھ "بِسْمِ اللّٰہ....." پڑھی اور نہ ہی دوسری سورت کے ساتھ۔ پھر وہ یہ اضافہ کرتا ہے کہ مہاجرین کے علاوہ انصار بھی وہاں موجود تھے اور انہوں نے بھی اس پر اعتراض کیا۔

یہ روایت حاکم نے بھی نقل کی ہے اور کہا ہے کہ شیخین (بخاری و مسلم) کے شرائط کے مطابق یہ روایت صحیح ہے۔

[۱] بہت سی روایات کے مطابق رسول اکرمؐ قرآن مجید کی سورتوں کیساتھ ہمیشہ بِسْمِ اللّٰہ..... کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ اس بارے میں آمدہ روایات میں سے ایک روایت ہم بِسْمِ اللّٰہ کے جزوِ قرآن ہونیکی نقل کر چکے ہیں (باقی اگلے صفحہ پر)

ان دلائل کی روشنی میں پوری صراحت اور جرأت کے ساتھ یہ کہا جانا چاہیے کہ بلاشبہ یہ روایت جعل اور جھوٹ کے علاوہ کچھ نہیں۔

(پچھلے صفحے سے آگے) دیگر چند روایتیں درج ذیل ہیں:

قتادہ نے انس سے نقل کیا ہے کہ رسول اکرمؐ سورۂ حمد "مد" کے ساتھ اور کھینچ کر پڑھتے تھے۔ پھر "بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ" کی آیت شروع کرتے تھے۔ بِسۡمِ اللّٰہِ مد کے ساتھ پڑھتے اور رَحۡمٰن و رَحِیۡم کو بھی مد کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ (سنن بیہقی۔ جلد ۲۔ صفحہ ۴۶ اور مستدرک حاکم۔ جلد ۱۔ صفحہ ۲۳۳)۔

شریک نے انس سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے رسول اکرمؐ کو سنا کہ "بِسۡمِ اللّٰہِ ...." بلند آواز سے پڑھتے تھے۔ حاکم نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث کے راوی مکمل طور پر معتبر ہیں۔

عسقلانی کہتا ہے: میں نے فجر اور مغرب کی نماز میں معتمر بن سلیمان کی اقتدا میں پڑھیں اور میں نے سنا کہ وہ سورۂ حمد سے پہلے بھی اور بعد میں بھی بلند آواز سے بِسۡمِ اللّٰہِ کی تلاوت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ میں نے ہمیشہ نماز میں اپنے والد کی اقتدا کی ہے، میرے والد بتاتے تھے کہ میں ہمیشہ انس کی نماز میں شامل ہوتا تھا اور انس فرماتے تھے کہ میں ہمیشہ نماز میں رسول اکرمؐ کے ساتھ شریک ہوا کرتا تھا اور وہ نماز میں جس سورت کی بھی تلاوت کرتے اس کے ساتھ بِسۡمِ اللّٰہِ بلند آواز سے پڑھتے تھے۔ حاکم کہتا ہے کہ اس حدیث کے تمام راوی معتبر اور ثقہ ہیں۔ (مستدرک۔ جلد ۱۔ صفحات ۲۳۳ اور ۲۳۴)۔

ابونعامہ نے انس سے نقل کیا ہے کہ رسول اکرمؐ اور ابوبکر اور عمر میں سے کوئی بھی "بِسۡمِ اللّٰہِ" بلند آواز سے نہیں پڑھتا تھا۔ (سنن بیہقی۔ جلد ۲۔ صفحہ ۵۲)۔ باقی اگلے صفحہ پر۔

جہاں تک دوسری روایات کے جواب کا تعلق ہے، جو کچھ ہم نے پہلی روایت کے بارے میں کہا ہے اس سے اس روایت کی کمزوری خود بخود واضح ہو جاتی ہے جسے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

مصنف: ان تمام روایات سے پتا چلتا ہے کہ رسول اکرمؐ نماز میں سورۂ حمد اور دوسری سورتوں کے ساتھ "بِسۡمِ اللّٰہ ...." کی تلاوت کرتے تھے۔

لہٰذا انس کی یہ روایت کہ جس میں وہ کہتے ہیں: رسول اکرمؐ قرآن کی سورتوں کے ساتھ بِسۡمِ اللّٰہ نہیں پڑھتے تھے اور اسی بنا پر کچھ لوگوں نے کہا کہ "بِسۡمِ اللّٰہ" قرآن کا جزو نہیں ہے، اس کے کوئی اور معنی ہوں گے۔ شاید اس روایت میں بِسۡمِ اللّٰہ کی تلاوت نہ کرنے سے مراد جہری ہو یعنی رسول اکرمؐ بِسۡمِ اللّٰہ کی تلاوت با آواز بلند نہ کرتے ہوں۔ اس پر انس کی مذکورہ بالا روایت گواہ ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ رسول اکرمؐ بِسۡمِ اللّٰہ بلند آواز سے نہیں پڑھتے تھے۔

اس امر کی ایک اور شہادت یہ ہے کہ زیر بحث روایت میں انس صریحاً یہ نہیں کہتے کہ رسول اکرمؐ نماز میں بِسۡمِ اللّٰہ نہیں پڑھتے تھے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ میں نے آنحضرتؐ سے نماز میں بِسۡمِ اللّٰہ نہیں سنی۔

نہ سننا نہ پڑھنے کی دلیل نہیں ہے۔ شاید رسول اکرمؐ با آواز بلند نہیں پڑھتے تھے کہ انس سن سکتے۔ بعض دوسری روایات میں آیا ہے کہ انس نے کہا: میں نے رسول اکرمؐ ابوبکر اور عمر میں سے کسی کو بھی با آواز بلند "بِسۡمِ اللّٰہ ...." پڑھتے نہیں سنا۔ ایک اور روایت میں کہتے ہیں: رسول اکرمؐ نے ہمیں نماز پڑھائی اور ہم نے انہیں بِسۡمِ اللّٰہ کی قرائت کرتے نہیں سنا۔ سنن نسائی - جلد ا۔ صفحہ ۱۴۴۔

اگر انس کی روایت کے یہ معنی لیے جائیں تو پہلی روایتوں کے ساتھ اسکا (باقی اگلے صفحہ پر)

علاوہ ازیں اس روایت کے مندرجات ہمارے نزدیک اسلام کے مسلمہ امور کے خلاف ہیں جیسے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ سورۂ حمد اور دوسری قرآنی سورتوں کے شروع میں "بسم اللہ" کا پڑھنا خواہ وہ ثواب اور برکت

(پچھلے صفحے سے آگے) اختلاف باقی نہیں رہتا۔

صحیح مسلم میں ایک اور روایت بھی اس مضمون کی آئی ہے کہ رسولِ اکرمؐ اور اسی طرح ابوبکر اور عمر میں سے کوئی بھی نماز میں "بسم اللہ" نہیں پڑھتا تھا۔ نہ تو سورۂ حمد کے شروع میں اور نہ ہی اس کے آخر میں۔ (صحیح مسلم۔ جلد ۲۔ صفحہ ۱۲) لیکن اس روایت کی سند میں ولید بن مسلم قرشی موجود ہے اور اس کا معتبر ہونا شک و شبہ سے خالی نہیں بلکہ جیسا کہ تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ بعض علماء نے صریحاً کہا ہے کہ ولید بن مسلم روایت کرنے میں زیادہ غلطیوں کا مرتکب ہوتا تھا اور عیاری سے کام لیتا تھا۔

تیسری روایت جو بظاہر مذکورہ بالا روایات کے خلاف ہے قتادہ کی ہے۔ وہ انس سے نقل کرتا ہے کہ رسول اکرمؐ، ابوبکر، عمر اور عثمان نماز کی قرأت "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" سے شروع کرتے تھے۔ (صحیح ترمذی، جلد ۲۔ صفحہ ۴۵۔ سنن ابوداؤد۔ جلد ۱۔ صفحہ ۱۲۵، اور سنن نسائی۔ جلد ۱۔ صفحہ ۱۴۳)۔

تاہم ہو سکتا ہے کہ اس روایت کے بھی ایسے معنی ہوں جو مذکورہ بالا روایات سے مطابقت رکھتے ہوں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے مراد خود وہ آیت نہیں ہے بلکہ اس سے سورۂ حمد مراد ہے کیونکہ بعض اوقات سورۂ حمد یا فاتحۃ الکتاب کو یہی نام دیا جاتا ہے۔ اس توضیح کے بعد روایت کے معنی یوں ہوں گے کہ رسول اکرمؐ، ابوبکر، عمر اور عثمان نماز کو سورۂ فاتحۃ الکتاب سے شروع کرتے تھے اور یہ معنی نہیں ہوں گے کہ وہ سورۂ فاتحہ کو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے جملے کے ساتھ شروع کرتے (باقی اگلے صفحے پر)

کی خاطر ہی کیوں نہ ہو مستحسن اور مستحب ہے۔ اس صورت میں یزید بن مغفل کس بنا پر قرآن کی سورتوں کی ابتدا میں بسم اللہ پڑھنے سے منع کرتا ہے اور اسے مسلمانوں کے درمیان ایک بڑی بدعت قرار دیتا ہے؟

مسلمانوں کی روش

ابتدائے اسلام سے اب تک مسلمانوں کی یہ عام روش رہی ہے کہ سورۂ برائت کو چھوڑ کر قرآن کی باقی تمام سورتوں کے شروع میں بسم اللہ پڑھتے ہیں اور بطور تواتر ثابت ہو گیا ہے کہ خود رسولِ اکرمؐ بھی ان سورتوں کے شروع میں بسم اللہ پڑھا کرتے تھے۔ اگر بسم اللہ قرآن کی سورتوں کا حصہ نہ ہوتی تو آنحضرتؐ کے لیے لازم تھا کہ اس بارے میں صراحت سے بیان فرماتے۔ یہ بات ذہن میں رکھتے ہوئے کہ آپ بیان اور تعلیم کے مقام پر فائز تھے آپ کے اندازِ قرائت سے پتا چلتا ہے کہ آپ جو کچھ پڑھتے تھے وہ قرآن تھا اور حضور جو کچھ تلاوت فرماتے تھے اگر اس کا کچھ حصہ جزوِ قرآن

(پچھلے صفحے سے آگے) تھے اور اس سورت کے شروع میں "بسم اللہ ....." نہیں پڑھتے تھے۔ فقط اس روایت میں نہیں بلکہ کئی ایک دوسری روایات میں بھی یہی کہا گیا ہے۔ نیز شافعی نے بھی ان سب کے وہی معنی لیے ہیں جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں۔

پس اس تحقیق اور مطالعے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر روایات کے مابین ذرہ بھر اختلاف موجود نہیں ہے اور جو روایات اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ رسول اکرمؐ نماز میں پڑھی جانے والی ہر سورت کے آغاز میں "بسم اللہ ....." تلاوت فرمایا کرتے تھے وہ مکمل طور پر درست اور غیر متنازعہ ہیں۔

نہ ہوتا تو آپ لازمی طور پر لوگوں کو بتا دیتے۔ بصورت دیگر اس کا مطلب تحریفِ حقیقت، غلط تعلیم اور لوگوں کی جہالت و نادانی کو تقویت پہنچانا ہوتا جب کہ رسولِ خدا سے ایسا عمل سرزد ہونا قبیح ہے۔ بالخصوص ایسے موضوع کے بارے میں قباحت بڑھ جاتی ہے جس کا تعلق وحی سے ہو۔ رسولِ اکرمؐ کی ذاتِ اقدس ان چیزوں سے پاک اور مبرّا ہے۔

رسولِ اکرمؐ قرآن مجید کی سورتوں کے شروع میں جو بِسۡمِ اللّٰہ پڑھتے تھے اگر وہ قرآن کا حصہ نہ ہوتا تو آپ یہ بات لوگوں کو بتلا دیتے اور آپ کا ارشاد متواتر اور حتمی روایتوں کی شکل میں ہم تک آ پہنچتا جبکہ یہ بات خبر واحد کی شکل میں بھی نقل نہیں کی گئی اور نہ ہم تک پہنچی ہے۔

۴۔ قرآن مجید کے تمام نسخوں میں بِسۡمِ اللّٰہ کا موجود ہونا

ایک ایسی بات کہ جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں وہ یہ ہے کہ عثمان کے قرآن جمع کرنے سے پہلے اور بعد میں قرآن کے جو نسخے صحابہ اور تابعین کے پاس تھے ان سب میں بِسۡمِ اللّٰہ موجود تھی اور یہ آیت سورۂ برائت کے علاوہ تمام سورتوں کے شروع میں لکھی گئی تھی۔ اگر بِسۡمِ اللّٰہ قرآن کا حصہ نہ ہوتی تو وہ اسے قرآن مجید کے نسخوں میں تحریر نہ کرتے کیونکہ جو چیز قرآن کا حصہ نہ ہوتی تھی صحابہ اسے اس انداز سے ضبط تحریر میں لانے سے اجتناب برتتے تھے حتیٰ کہ بعض مسلمان قرآن میں اعراب اور نقطے لگانے سے بھی روکتے تھے۔

لہٰذا اصحابۂ رسولؐ اور تابعین کے نسخہ ہائے قرآن میں بِسْمِ اللّٰہ کا ہونا اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ ان کی نظر میں بِسْمِ اللّٰہ بھی ——— ان آیات کی طرح جن کی قرآن مجید میں تکرار ہوئی ہے ——— قرآن کا جزو ہے۔

اس گفتگو سے واضح ہو جاتا ہے کہ "بِسْمِ اللّٰہ" قرآن میں اس لیے درج کی گئی ہے کہ یہ اس کا جزو ہے اور اس سے فقط سورتوں میں فاصلہ رکھنا مقصود نہیں ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ "بِسْمِ اللّٰہ" فقط سورتوں میں فاصلہ رکھنے کے لیے ہے ان کے نظریے کی تردید کے لیے یہ ایک اور دلیل ہے کہ سورۂ حمد میں تو بِسْمِ اللّٰہ درج ہے لیکن سورۂ برائت میں درج نہیں۔ اگر اس کا مقصد فقط نشان لگانا اور سورتوں کے درمیان فاصلہ رکھنا ہوتا تو معاملہ برعکس ہوتا۔ اس صورت میں بِسْمِ اللّٰہ سورۂ برائت سے پہلے لکھی جاتی اور سورۂ حمد سے پہلے نہ لکھی جاتی۔ یہ اس امر کی ایک اور قطعی دلیل ہے کہ بِسْمِ اللّٰہ سورۂ حمد کی آیتوں میں سے ایک مستقل آیت ہے۔ اس صورت میں یہ اس کے ایک حصے کے طور پر نازل ہوئی ہے اور سورۂ برائت میں نازل نہیں ہوئی۔

مخالفین کے دلائل

جو لوگ بِسْمِ اللّٰہ کو قرآن کی سورتوں کا جزو نہیں سمجھتے انہوں نے اپنے خیال کی تائید میں چند دلائل پیش کیے ہیں۔

(۱) وہ کہتے ہیں کہ کسی چیز کا جزوِ قرآن ثابت ہونا تواتر پر منحصر ہے۔

لہٰذا جس چیز کے ثابت ہونے میں اختلاف اور جھگڑا ہو وہ قرآن کا جزو نہیں ہو سکتی۔ چونکہ بِسْمِ اللہ کے جزو قرآن ہونے کے بارے میں بھی نزاع و اختلاف ہے لہٰذا اسے جزو قرآن شمار نہیں کیا جا سکتا۔

جواب

ان لوگوں کے جواب میں ہم کہتے ہیں:

۱۔ بِسْمِ اللہ کا جزوِ قرآن ہونا اہلِ بیت رسولؐ کے فرمودات سے قطعیت اور تواتر کے ساتھ ثابت ہو گیا ہے اور جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اللہ کے رسولؐ کے ارشاد کے مطابق ان کے اقوال کا حجت اور مدرک ہونا مسلّم اور قطعی ہے لہٰذا جو کچھ ائمہ اہل بیتؑ سے تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچے وہ ایسا ہی ہے گویا رسول اکرمؐ سے تواتر کے ساتھ پہنچا ہو اور ان ہر دو صورتوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

۲۔ جب بہت سے صحابہ بِسْمِ اللہ کے جزو قرآن ہونے کی شہادت دیتے ہیں اور روایات بھی تواتر معنوی کے ساتھ اس پر دلالت کرتی ہیں تو اس کے جزو قرآن نہ ہونے کے بارے میں چند لوگوں کا نظریہ کہ جو ایک بے حقیقت اور باطل قیاس آرائی کے نتیجے میں وجود میں آیا ہو اس تواتر کو رتی بھر نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

۳۔ تواتر کے طور پر ثابت ہو گیا ہے کہ رسولِ اکرمؐ جب کبھی قرآن کی کسی سورت کی تلاوت فرماتے تھے تو بِسْمِ اللہ بھی پڑھتے تھے درآنحالیکہ آپ بیان اور تعلیم کے مقام پر فائز تھے لیکن آپ نے کبھی نہیں کہا کہ یہ بِسْمِ اللہ جو میں پڑھ رہا ہوں قرآن کا جزو نہیں ہے۔ بنا بریں یہ

چیز اس بات پر قطعی اور مسلّم دلیل ہے کہ بسم اللہ جزو قرآن ہے۔

بلاشبہ وہ واحد چیز جو یہاں کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کا عمل بسم اللہ کا جزو قرآن ہونا ہی نہیں بلکہ اس کا قرآن ہونا ثابت کرسکتا ہے اور اسے جزو قرآن ثابت کرنے کے لیے بھی ان کثیر روایات کے علاوہ جو اس بارے میں شیعہ اور سنی ذرائع سے وارد ہوئی ہیں ہم صرف ان روایات پر اکتفا کرسکتے ہیں جو پہلے نقل کی جاچکی ہیں اور انہی روایات سے بسم اللہ کا قرآن کی سورتوں کا جزو ہونا ثابت کرسکتے ہیں کیونکہ اس کا قرآن ہونا ثابت کرنے کے لیے متواتر، مسلسل اور تسلی بخش روایات ضروری ہیں لیکن بسم اللہ کا کسی ایک سورت کا جزو ہونا خبر واحد سے بھی ثابت ہوسکتا ہے اور اس معاملے میں تواتر کے لازم ہونے پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

۲- وہ کہتے ہیں کہ مسلم نے ابو ہریرہ سے یوں نقل کیا ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: خدا نے فرمایا ہے کہ میں نے اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نماز کے دو حصے کر لیے ہیں اور میرا بندہ جو کچھ مانگے گا میں اسے دوں گا۔ پس جب میرا نمازی بندہ کہتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ تو خدا فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میرا شکر ادا کیا اور جب وہ کہتا ہے "الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" تو خدا فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری ثنا کی اور جب وہ کہتا ہے "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" تو خدا فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری ستائش کی اور جب وہ کہتا ہے "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" تو خدا فرماتا ہے یہ چیز میرے اور بندے کے درمیان ہے اور وہ جو کچھ چاہے گا میں اسے دوں گا اور جب کہتا ہے "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ..... وَلَا الضَّآلِّيْنَ"

تو خدا فرماتا ہے یہ میرے بندے کے لیے ہے اور میرا بندہ جو کچھ چاہے گا وہ اسے ملے گا۔[1]

اس حدیث سے استدلال کرنے کا انداز یہ ہے کہ اس کا ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ سورۂ حمد کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ تک ہے جو کہ چوتھی آیت کا نصف ہے "خدا کے لیے ہے" اور دوسرا حصہ جو اسی آیت کے نصف سے لے کر سورت کے خاتمے تک ہے نمازی کے لیے ہے۔ یہ دو حصے آیات کی تعداد کے لحاظ سے بھی باہم مساوی ہیں اور "نصف خدا کے لیے اور نصف نمازی کے لیے" کے مسئلے کی بھی وضاحت کرتے ہیں جو کہ روایت میں آیا ہے لیکن اگر بِسْمِ اللّٰہ کو سورت کا جزو سمجھا جائے تو اس صورت میں حدیث کے معنی صحیح نہیں ہوں گے کیونکہ جیسے کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے سورۂ حمد مجموعی طور پر سات آیتوں پر مشتمل ہے اور اگر بِسْمِ اللّٰہ اس کا جزو ہو تو ضروری ہے کہ صِرَاطَ الَّذِیْنَ سے آخر تک ایک آیت شمار کی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ سورت کے پہلے حصے کی چار آیتیں اور دوسرے حصے کی ڈھائی آیتیں ہوں گی اور سورت کو برابر دو حصوں میں تقسیم کرنے کا موضوع صحیح نہیں ہو گا۔

جواب

ہماری جانب سے اس روایت کا جواب یہ ہے کہ:

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲۔ صفحہ ۶۔ سنن ابی داؤد جلد ۱۔ صفحہ ۳۰۔ اور سنن نسائی۔ جلد ۱۔ صفحہ ۱۴۴۔

(۱) یہ روایت "علاء" سے نقل کی گئی ہے اور علم رجال کے علماء نے اس کے ثقہ اور ضعیف ہونے کے بارے میں مختلف باتیں کہی ہیں لہٰذا اس روایت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) اگر اس روایت کی دلالت صحیح ہو تب بھی یہ دوسری صحیح روایت کے خلاف ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ بِسۡمِ اللّٰہ کے بغیر نہیں بلکہ بِسۡمِ اللّٰہ کے ساتھ سورۂ حمد کی سات آیتیں ہیں۔ ہم نے ان روایات میں سے چند روایات پہلے نقل کی ہیں۔

(۳) یہ روایت اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ یہ تقسیم سورۂ حمد کے الفاظ کے مطابق ہوئی ہے بلکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ تقسیم معنی کے لحاظ سے ہوئی ہے اور مقصد یہ ہے کہ اپنے معنی اور مفہوم کے مطابق نماز کے کچھ حصے خدا سے اور کچھ بندوں سے متعلق ہیں۔

(۴) اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ یہ تقسیم معانی کے مطابق نہیں بلکہ الفاظ کے مطابق ہے تو اس کی کیا دلیل ہے کہ یہ تقسیم آیات کے مطابق ہے بلکہ اس بات کا احتمال ہے کہ یہ سورۂ حمد کے کلمات کے مطابق ہو کیونکہ ان آیتوں کے کلمات جو جملہ "اِيَّاكَ نَعۡبُدُ ...." سے پہلے آئی ہیں اور اسی طرح ان آیتوں کے کلمات جو اس جملے کے بعد آئی ہیں بِسۡمِ اللّٰہ کو شامل کر کے اور مکررات کو حذف کر کے دس ہیں۔

(۵) یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ بِسۡمِ اللّٰہ کے سورتوں کا جزو نہ ہونے کے بارے میں ایک روایت ہے جو ابوہریرہ نے نقل کی ہے اور وہ یہ ہے کہ سورۂ کوثر کی تین آیتیں ہیں[۱] اور سورۂ ملک کی تیس آیتیں ہیں[۲] اور اگر بسم اللہ

---

[۱] میں نے حدیث کی کتابوں میں ایسی کوئی روایت نہیں دیکھی۔ مصنف [۲] (اگلے صفحہ پر)

سورت کا جزو ہو تو ان دونوں سورتوں کی آیتوں کی تعداد اس سے بڑھ جائے گی جو ابوہریرہ نے بتائی ہے۔

جواب

اگر اس روایت کو جو ابوہریرہ نے سورۂ کوثر کے بارے میں نقل کی ہے صحیح بھی مان لیا جائے تو یہ اس روایت کے خلاف ہے جو انس نے نقل کی ہے اور جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔[1] انس کی روایت صحیح اور قابلِ قبول روایات میں سے ہے جسے موطا[2] کے علاوہ تمام صحاح نے نقل کیا ہے لہٰذا ابوہریرہ کی روایت کو یا تو رد کر دینا چاہیے اور یا اس کی تاویل اس طرح کرنی چاہیے کہ یہ روایت ان دو سورتوں کی تمام آیتوں کی نہیں بلکہ خاص آیتوں کی تعداد بتاتی ہے اور بسم اللہ ایک ایسی آیت ہے جو قرآن مجید کی تمام سورتوں میں مشترک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر سورتوں کی آیات گنتے وقت اسے شامل نہیں کیا جاتا۔[3]

(پچھلے صفحے سے آگے) مستدرک حاکم جلد ۱۔ صفحہ ۵۶۵۔ صحیح ترمذی۔ جلد ۱۱۔ صفحہ ۲۰۔ کنز العمال جلد ۱۔ صفحات ۵۱۶ تا ۵۲۵۔

[1] گزشتہ صفحات میں "اہل سنت کی روایات" کے عنوان کے تحت پہلی حدیث ملاحظہ کریں۔ [3] تیسیر الوصول۔ جلد ۱۔ صفحہ ۱۹۹۔

سورت کا پہلا حصہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝

قرائت کی طرز

۱۔ علم قرائت کے اکثر علماء نے "الحمد" کی "دال" کو پیش کے ساتھ اور "للہ" کے لام کو زیر کے ساتھ پڑھا ہے لیکن ان میں سے بعض الحمد کی "دال" کو اعراب اور حرکت میں للہ کے لام کے تابع کر کے جو کہ اس کے بعد واقع ہوا ہے، اسے اسی کی طرح زیر کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ بعض نے اس کے بالکل برعکس "للہ" کے لام کی قرائت کو الحمد کی دال کے تابع کر دیا ہے جو کہ اس سے پہلے واقع ہے اور اسی کی طرح اسے پیش کے ساتھ پڑھتے ہیں تاہم یہ دو قرائتیں بہت شاذ اور غیر معروف ہیں

اوران کی جانب توجہ دینے کی ضرورت نہیں۔

۲- کلمہ "مَالِكِ" کے بارے میں بھی مختلف قرائتیں نقل ہوئی ہیں بعض قاریوں نے اسے لام کو ساکن کر کے "فَلْس" کی شکل میں "مَلْكِ" پڑھا ہے اور بعض دوسروں نے "فَعِيل" کی مانند "مَلِيكِ" پڑھا ہے اور ابو حنیفہ نے اسے فعل ماضی کے صیغے میں "مَلَكَ" تلاوت کیا ہے تاہم ان میں سے کوئی قرائت بھی معتبر اور قابل توجہ نہیں اور یہ شاذ اور غیر معروف ہیں۔ علم قرائت کے اکثر علماء نے اسے "فَاعِل" کی شکل میں "مَالِكِ" یا "كَتِف" کی شکل میں "مَلِكِ" پڑھا ہے اور اس بارے میں یہ مشہور ترین اور صحیح ترین قرائت ہے۔

ان دو قرائتوں میں سے کونسی بہتر ہے؟

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کلمہ "مَالِكِ" کی مختلف قرائتیں ہیں اور ان میں سب سے اہم اور صحیح دو مشہور قرائتیں "مَلِكِ" اور "مَالِكِ" ہیں۔ تاہم ان دو قرائتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنے اور اسے دوسری پر ترجیح دینے کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔

بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ "مَالِكِ" زیادہ صحیح ہے کیونکہ اس کا مفہوم "مَلِكِ" سے زیادہ وسیع اور زیادہ عام ہے مثلاً اگر کہا جائے کہ فلاں شخص قوم کا مالک ہے تو اس جملے سے پتا چلتا ہے کہ وہ ملکیت اور مالکیت کے حق کے علاوہ جو اس کلمے کا اصلی مفہوم ہے لوگوں پر سلطنت اور بادشاہی

کا حق بھی رکھتا ہے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ فلاں شخص قوم کا ملک ہے تو اس جملے سے ملکیت اور مالکیت کا نہیں بلکہ فقط سلطنت اور بادشاہی کا پتا چلتا ہے جو خود ملک کے کلمے کا اصلی صحیح مفہوم ہے۔ دوسرے لفظوں میں "مَالِكِ" میں "مَلِكِ" کا مفہوم شامل ہے لیکن مَلِكِ میں "مَالِكِ" کا مفہوم شامل نہیں ہے۔

ایک اور گروہ کہتا ہے کہ مَلِكِ کی قرائت "مَالِكِ" سے بہتر ہے اور اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ کلمہ "مَالِكِ" کی اضافت عموماً وقت کے ساتھ نہیں ہوتی بلکہ یہ کلمہ "مَلِكِ" ہے جو وقت کی طرف اضافہ ہوتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے "مَلِكُ الْعَصْرِ" یا "ملوك الاعصار المتقدمة" لہٰذا "مَلِكِ" کی قرائت جو موجودہ صورت میں وقت اور "يَوْمِ الدِّيْنِ" کی طرف اضافہ ہوا ہے، بہتر اور قابل ترجیح ہے۔

یہ تھے فریقین کے استدلال کے نمونے جن کی بنا پر انہوں نے دو قرائتوں میں سے ایک کا انتخاب کیا ہے اور اسے ترجیح دی ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس بحث سے کوئی فائدہ نہیں اور بنیادی طور پر دو معروف قرائتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا اور اسے برتر ٹھہرانا ممکن نہیں ہے کیونکہ اگر یہ قرائتیں تواتر، تسلسل اور اطمینان بخش روایات کے ساتھ رسول اکرمؐ سے ثابت ہوں تو یہ سبھی قرآن کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور قرآن کی آیات اور کلمات میں کوئی تفاوت نہیں اور اگر یہ قرائتیں تواتر کے ذریعے ثابت نہ ہوں ـــــ اور حقیقت بھی یہی ہے ـــــ تو اس صورت میں اگر ایک قرائت کو ترجیح دینا اور اسے برتر سمجھنا دوسری قرائت کے باطل ٹھہرنے کا سبب ہو تو ایک قرائت کے دوسری قرائت سے برتر ہونے کے بارے میں تحقیق کرنے اور ان میں سے ایک کا انتخاب کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن بات یہ ہے کہ ایک قرائت کو دوسری قرائت پر ترجیح دینے

سے اس دوسری قرائت کا باطل ہونا ثابت نہیں کیا جا سکتا اور اگر ایک قرائت کی دوسری قرائت پر ترجیح کے بارے میں بحث اور تحقیق اس دوسری قرائت کا باطل ہونا ثابت نہ کرے ــــــ جیسا کہ اکثر ہوتا ہے ــــــ تو اس صورت میں یہ بحث بے فائدہ ہوگی کیونکہ یہ بات ثابت اور مسلم ہے کہ معروف قرائتوں میں کوئی فرق ڈالے بغیر ہر ایک کی پیروی کی جا سکتی ہے۔

بلاشبہ ایک قرائت کو دوسری قرائت پر ترجیح دینے کے بارے میں بحث بالخصوص موجودہ معاملے میں، بے فائدہ ہے کیونکہ "مَلِكِ" اور "مَالِكِ" میں فرق یہ ہے کہ "مَلِكِ" کا کلمہ اعتباری اور عارضی سلطنت کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس صورت میں سلطنت کے مراتب مواقع کی تبدیلی کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی یہ ملکیت کے ساتھ منسلک ہوتی ہے اور کبھی اس سے خالی ہوتی ہے لیکن اگر یہ کلمہ خدا کے لیے استعمال کیا جائے جس کی سلطنت حقیقی ہے تو اس صورت میں اس کے مراتب میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ وہ ہمیشہ مالکیت کے ساتھ منسلک رہے گا اور اس کا وہی مفہوم ہوگا جو کلمہ "مَالِكِ" کا ہے، اس طرح وہ کلمۂ مَالِكِ سے برتر نہیں ہوگا۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ وقت کی جانب "مَالِكِ" کا اضافہ اگر خدا کے علاوہ کسی دوسرے کے بارے میں جائز نہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ خدا کے بارے میں بھی جائز نہیں ہے کیونکہ وہ جس طرح تمام موجودات کا مالک ہے اسی طرح وقت کا بھی واقعی مالک ہے پس وقت کی جانب اضافہ ہونے میں کلمہ مَالِكِ "مَلِكِ" کے برابر ہے اور اس لحاظ سے بھی "مَلِكِ" کا کلمہ "مَالِكِ" سے برتر نہیں ہو سکتا۔

بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ چونکہ "يَوۡمِ الدِّيۡنِ" پر مَالِكِ کا اضافہ لفظی

اضافہ ہے اور معرفہ بنانے کے لیے مفید نہیں ہے لہٰذا وہ اپنی نکرہ کی حیثیت پر باقی رہتا ہے اور جو جملہ نکرہ ہو وہ اللہ کے لیے جو معرفہ ہے وہ وصف نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مَلِكِ پڑھنا چاہیے کیونکہ مَلِك سے مراد سلطان ہے اور اس معنی کے ساتھ یہ کلمہ جامد اور کلمہ اسمی اور غیر مشتق کے حکم میں آتا ہے اور ایسے کلمے کا اضافہ معرفہ بنانے کے لیے بھی مفید ہے۔ اس صورت میں نکرہ کے معرفہ کا وصف ہونے کی دقت بھی پیش نہیں آتی۔

دوسروں کا جواب

تفسیر کشاف اور دوسری کتابوں میں اس اعتراض کا جواب یوں دیا گیا ہے کہ اسم فاعل کا اضافہ اس صورت میں لفظی ہے اور معرفہ نہیں بن سکتا جب وہ اسم فاعل حال یا آئندہ کے معنوں میں ہو لیکن اگر وہ ماضی کے معنوں میں ہو یا اس سے مراد دوام اور ہمیشگی ہو تو اس صورت میں اسم فاعل کا اضافہ معنوی ہوگا اور اپنے مضاف الیہ سے "تعریف" حاصل کریگا مثلاً

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا" [1]

سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور فرشتوں کو قاصد قرار دینے والا ہے۔

تَنْزِيْلُ الْكِتَابِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۙ غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ۙ ذِى الطَّوْلِ۔ [2]

---

[1] سورۂ فاطر۔ آیت ۱ [2] سورۂ مومن۔ آیت ۲ اور ۳

"یہ کتاب خدا کی بھیجی ہوئی ہے۔ وہ خدا جو غالب اور دانا اور گناہوں کا بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔ وہ سخت عذاب دینے والا اور صاحب فضل و کرم ہے۔"

جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں پہلی آیت میں فَاطِر اور جَاعِل ماضی کے معنوں میں ہیں اور دوسری آیت میں "غَافِرِ الذَّنبِ" اور "قَابِلِ التَّوبِ" دوام اور ہمیشگی کے لیے ہیں اور اضافے کے نتیجے میں معرفہ ہو گئے ہیں، اور اللہ کا وصف قرار پاتے ہیں۔ مَالِك کے اضافے کی بھی یہی نوعیت ہے کیونکہ کلمہ مَالِك کا مفہوم یعنی قیامت کے دن خدا کی مالکیت مستقل ہے لہٰذا اس کا اضافہ معنوی ہے اور تعریف حاصل کر سکتا ہے اور تعریف حاصل کرنے کی بدولت اَللّٰه کا وصف قرار پاتا ہے۔

ہمارا جواب

اس اعتراض کے بارے میں جو تحقیق کی گئی ہے اس کی روشنی میں اس کا جواب یہ ہے کہ بنیادی طور پر اضافہ خواہ وہ لفظی ہو یا معنوی ہو "تعریف" اور تعیّن کے لیے کارآمد نہیں ہے بلکہ وہ تخصیص یعنی کسی لفظ کے مفہوم اور مصادیق کے دائرے کو ایک طرح سے محدود کرنے کے لیے مفید ہے۔ جہاں تک تعریف اور تعیّن کا تعلق ہے اس کے لیے اضافے کی بجائے دوسری نظروں اور حالتوں سے استفادہ کرنا چاہیے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ جیسا کہ ظاہر ہے ان دو جملوں یعنی "غُلَامٌ لِزَيدٍ" اور "غُلَامُ زَيدٍ" میں کوئی فرق نہیں ہے اور جیسا کہ پہلے جملے کا غلاموں کی تخصیص اور ان کی تعداد اور مصادیق کم کرنے

کے علاوہ اور کوئی فائدہ نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ زید کے کئی غلام ہوں نیز دوسرے جملے کی طرح معنوی اضافے کی صورت میں بھی فقط تخصیص حاصل ہو سکتی ہے۔ اسی طرح لفظی اضافے سے بھی افراد کی تخصیص کی جا سکتی ہے اور انہیں کم کیا جا سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اتنا فرق ہے کہ لفظی اضافے میں تخصیص اضافے کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کے بغیر بھی حاصل ہو سکتی ہے اور اضافے سے تخفیف کے علاوہ کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

اصل بات یہ ہے کہ اضافہ خواہ لفظی ہو یا معنوی تخصیص کے لیے مفید ہے لیکن تعریف اور تعیّن کے لیے مفید نہیں ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کلمۂ "مضاف" کسی کلمۂ "معرفہ" کا وصف نہیں بن سکتا کیونکہ اگر وصف ہونا فقط تخصیص پانے سے ثابت ہوتا ہو تو یہ چیز اضافے کی تمام صورتوں میں یکساں طور پر موجود ہے اور اضافہ خواہ لفظی ہو یا معنوی اگر اس سے معرفہ ہونے کا جواز نکلتا ہو تو ممکن ہے کہ وہ بھی بیرونی مثالوں اور علامتوں سے حاصل ہو سکے گویا کہ اضافے کی دونوں قسموں میں بیرونی علامتوں سے بھی یکساں طور پر تخصیص کا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

لہٰذا لفظی اور معنوی اضافے میں کوئی فرق نہیں ہے اور اضافے کی ان دونوں قسموں میں جو فرق بتایا گیا ہے وہ صحیح مفہوم کا حامل نہیں ہو سکتا۔

اس سلسلے میں بحث کی تکمیل کی خاطر جو دوسری بات کہنی چاہیے وہ یہ ہے کہ نقل کیا گیا ہے کہ علمائے ادب اس امر پر متفق ہیں کہ اگر لفظی اضافے میں مضاف صفت مشبہ ہو تو وہ معرفہ کا وصف نہیں ہو سکتا لیکن اگر مشبہ نہ ہو تو جیسا کہ سیبویہ نے خلیل اور یونس سے نقل کیا ہے ایسا مضاف معرفہ کا وصف ہو سکتا ہے۔ عربی لغت میں اس قسم کے وصف اور اضافے کی مثالیں موجود ہیں اور

ہمارا محل بحث بھی اسی نوعیت کا اضافہ ہو سکتا ہے۔

صاحب تفسیر کشاف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ میں لفظ مَالِكِ مستقل اور مسلسل مالکیت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس نظریے کا باطل ہونا بالکل واضح ہے کیونکہ موجودات پر خدا کا محیط ہونا اور اس کی مالکیت اگرچہ ہمیشہ جاری رہنے والی چیز ہے لیکن اس آیت میں لفظ مَالِكِ کی نسبت يَوْمِ الدِّيْنِ سے ہے اور یوم جزا بعد میں آنے والا ہے لہٰذا لازمی طور پر اسے مَالِكِ بھی ہمیشہ کے لیے نہیں بلکہ آئندہ کے لیے ہونا چاہیے۔

بعض علماء نے اسم فاعل مضاف کے بارے میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ اگر وہ ماضی کے لیے ہو تو تعین اور تشخص پیدا کرتا ہے اور معرفہ کے لیے صفت ہو سکتا ہے اور اگر حال یا مستقبل کے معنی میں ہو تو معرفہ کے لیے صفت قرار نہیں پا سکتا۔ ان دونوں کے باہمی تفاوت کے بارے میں انہوں نے کہا ہے کہ اگر اسم فاعل ماضی کے لیے ہو تو وہ چیز یقینی طور پر وقوع پذیر ہو چکی ہوتی ہے اور جو چیز وقوع پذیر ہو چکی ہو اسکی شناخت کی جا سکتی ہے اور وہ ایک معرفہ کا وصف قرار پا سکتی ہے لیکن جو اسم فاعل حال اور مستقبل کے لیے ہو اس میں یہ خصوصیت نہیں ہوتی۔

ہمارا خیال ہے کہ یہ فرق بے بنیاد ہے کیونکہ کسی چیز کے ثابت ہونے اور وجود میں آنے کے لیے اس کے بارے میں علم ہونا ضروری نہیں تاکہ وہ چیز معرفہ اور جانی پہچانی ہو اور بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ ماضی کے بارے میں علم نہ ہونے کی بنا پر وہ مستقبل کے برابر ہوتا ہے۔

المختصر اس بارے میں یہ تمام دلائل، اور خیالی قاعدے اور مصنوعی ضابطے بے بنیاد اور بیکار چیزیں ہیں۔ عربی زبان کے بارے میں فقط عرب فصحاء کی پیروی کرنی چاہیے اور انہیں سند ماننا چاہیے۔ نیز عربی کے

قواعد بھی انہیں کے مختلف استعمالات سے اخذ کرنے چاہئیں۔

لغات اور مفردات

اَلْحَمْدُ: یہ لفظ سپاس کے معنوں میں ہے اور ملامت کی ضد ہے۔ یہ ان اچھے افعال اور اعمال کے بدل کے طور پر استعمال ہوتا ہے جو اختیاری طور پر انجام پائیں خواہ ان نیک کاموں سے خود حمد کرنے والے کو فائدہ پہنچے یا دوسروں کو، لیکن لفظ شکر جو کفران کی ضد ہے یہ اس نیکی اور احسان کے صلے کی صورت میں استعمال ہوتا ہے جو ایک انسان کسی دوسرے انسان پر کرتا ہے۔

جہاں تک لفظ "مدح" کا تعلق ہے جو "ذم" کی ضد ہے یہ استعمال کے لحاظ سے عمومیت کا حامل ہے اور کسی شخص یا چیز کی اچھائی اور نیکی کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے خواہ ممدوح کی طرف سے اچھائی اور نیکی مدح کرنے والے تک پہنچے یا نہ پہنچے اور خواہ یہ نیکی انسانی فضیلت کی طرح اختیاری ہو یا سورج کی روشنی اور موتی کی چمک کی طرح غیر اختیاری ہو۔

لفظ "اَلْحَمْدُ" میں الف لام جنس کے لیے ہیں کیونکہ حمد کے لیے ظاہری اقرار کا کوئی وجود نہیں ہے۔

جہاں تک "الله"، "رَحْمٰن" اور "رَحِيْم" کے الفاظ کا تعلق ہے ان کی وضاحت پہلے ہی کی جا چکی ہے اور اسے دہرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

رَبّ: یہ لفظ ربب سے لیا گیا ہے اور اس کے معنی مالک، مصلح اور مربی کے ہیں۔ رَبِيْبَة کا مادہ بھی یہی ہے۔ لفظ رَبّ خدا کے علاوہ کسی اور کے لیے اضافت کے بغیر استعمال نہیں ہوتا مثلاً کہا جاتا ہے "رَبُّ السَّفِيْنَة"

یعنی کشتی کا مالک اور رَبُّ الدَّارِ یعنی گھر کا مالک۔

عَالَم: یہ رَھْط اور قَوْم کی طرح جمع ہے جس کا مفرد کوئی نہیں۔ اس کا اطلاق موجودات کے ہم جنسوں میں سے کسی ایک کے مجموعے پر ہوتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے: عالمِ جماد، عالمِ نبات وغیرہ ــــ اور بعض اوقات اس کا اطلاق کسی ایسے مجموعے پر ہوتا ہے جس کے اجزاء زمان یا مکان کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں مثلاً کہتے ہیں: "عالمِ کودکی" "عالمِ دنیا" اور "عالمِ آخرت"

اور بعض اوقات عَالَم کا لفظ کائنات کے مختلف اجزاء کے اختلافات اور تفاوت کے باوجود اسکی تمام موجودات کے لیے مجموعی طور پر استعمال ہوتا ہے۔

اس لفظ کی جمع واؤ اور نون کے ساتھ عَالَمُوْن بنائی جاتی ہے اور بعض اوقات اس کی جمع فَوَاعِل کی شکل میں ہوتی ہے اور عَوَالِم کہا جاتا ہے۔ عربی زبان میں اس لفظ کے علاوہ عین پر زبر کے ساتھ فَاعَل کے وزن پر کوئی لفظ نہیں ہے جس کی جمع واؤ اور نون سے بنتی ہو۔

مُلْك: اس لفظ کے معنی احاطہ اور سلطنت کے ہیں اور یہ احاطہ اور سلطنت بعض اوقات ظاہری اور واقعی حقیقت کی حامل ہوتی ہے۔ مثلاً خدا کا تمام موجودات کا احاطہ کیے ہونا اور ان پر سلطنت رکھنا کیونکہ ہر موجود کی ہستی اس کے پیدا کرنے والے اور ہستی بخشنے والے سے وابستہ ہوتی ہے اور اپنی ایجاد کرنے والی علت اور پیدا کرنے والے سے رابطے اور وابستگی کے علاوہ اس کی کوئی الگ حقیقت نہیں ہے۔ ہر ممکن موجود اپنی پیدائش اور بقاء کے لیے اپنی ہستی بخشنے والے کا محتاج اور نیازمند ہے۔ وہ ایک لحظے کے لیے بھی اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا اور کبھی

بھی ضرورت اور حاجت سے الگ نہیں ہوتا۔[1]

قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

"اللہ بے نیاز ہے اور تم محتاج ہو[2]"

بعض اوقات یہ سلطنت برائے نام اور فرضی یا رسمی ہوتی ہے جیسے کہ لوگوں کا چیزوں کا مالک ہونا۔ مثلاً زید کے اپنی ذاتی دولت کا مالک ہونے کے معنی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہیں کہ اس دولت کے بارے میں اس کی ملکیت اور خاص حق فرض کر لیا گیا ہے اور معتبر مانا گیا ہے۔ اسے اس پر قابض ہونے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا اختیار حاصل ہے۔ یہ فرض اور اعتبار بھی ضروریات، وسائل، عقد، یک طرفہ ذمہ داری، قبضے اور وراثت وغیرہ جیسے عارضی اقرار ناموں میں سے کسی ایک کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔

فلسفیوں کے نظریے کے مطابق ملکیت وہ ہیئت اور بناوٹ ہے جو ایک چیز کے دوسری چیز کا احاطہ کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ نو شکلوں میں سے ایک ہے اور اسے "جدہ" کے مقولے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کی مثال اس شکل کی سی ہے جو پگڑی کے انسان کے سر کا احاطہ کرنے سے یا انگوٹھی کے انگلی کا احاطہ کرنے سے وجود میں آتی ہے۔

دین

اس کے معنی جزا اور حساب کے ہیں اور مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے

---

[1] ملاحظہ فرمایئے "اسلام دین حکمت" مؤلفہ محمد حسینی بہشتی و محمد جواد باہنر بموضوع "یہ دنیا ایک وابستہ حقیقت ہے"۔ مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی

[2] سورۂ محمدؐ۔ آیت ۳۸۔

جملے سے یہ دونوں معنی لیے جاسکتے ہیں کیونکہ حساب جزا کی تمہید ہے اور حساب کا دن جزا کا دن ہی ہے۔

سپاس خدا کے لیے مخصوص ہے

"اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ" کے جملے سے خدا انسان کو اس حقیقت کی یاد دلاتا ہے کہ حمد کی اور ہر اس چیز کی ماہیت جسے حمد اور سپاس کا نام دیا جاتا ہے اس کی مقدس ذات کے لیے مخصوص ہے۔

یہ ایک ایسی مسلمہ اور واضح حقیقت ہے جس کی تائید اور ثبوت کے لیے بہت سے دلائل موجود ہیں۔ حمد اور سپاس کے ذاتِ باری تعالیٰ سے مخصوص ہونے کے دلائل میں سے کچھ ہم یہاں بطور نمونہ پیش کرتے ہیں:

(۱) کسی کام کا حسن اور کمال اس کام کے کرنے والے کے حسن اور کمال کا نتیجہ ہوتا ہے اور چونکہ خدا کمالِ مطلق ہے اور اس میں کوئی عیب اور نقص نہیں ہے لہٰذا اس کا ہر کام لازمی طور پر کامل، شائستہ اور نقص سے خالی ہوگا۔ یہی مطلب قرآن مجید میں بھی بیان کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہوا ہے:

"اے نبی! کہہ دیجیے کہ ہر شخص اپنی لیاقت اور صلاحیت کے مطابق کام انجام دیتا ہے۔[۱]"

پس چونکہ خدا کے سوا کوئی بھی ذات نقائص سے خالی نہیں لہٰذا اس کے اعمال بھی بے عیب نہیں ہو سکتے۔ پس جو عمل محض نیک اور ہر عیب

---

[۱] سورۂ بنی اسرائیل - آیت ۸۴

سے پاک ہو وہ خدا کی ذات سے مخصوص ہے اور کسی دوسرے ے ایسے کامل اور محض نیک کام کا انجام پانا ممکن نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ فقط خدا کی اقدس اور کامل ذات حمد اور سپاس کے لائق ہے اور اس کے علاوہ کوئی حمد اور سپاس کے لائق نہیں ہے۔ جملہ اَلحَمدُ لِلّٰہ بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس کا ثبوت مہیا کرتا ہے کیونکہ جیسا کہ اس سے پہلے ہم کہہ چکے ہیں کہ لفظ "اَللّٰہ" عَلَم اور اس اقدس اور مکمل ذات کا خاص نام ہے جو کمال و بزرگی کی تمام صفات کی مالک ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام اس بارے میں یوں ارشاد فرماتے ہیں:

"میرے والد امام باقر علیہ السلام کی ایک خچر گم ہو گئی۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر خدا کی عنایت سے یہ خچر مجھے مل گئی تو میں اسکی وہ حمد بیان کروں گا جو اسے خود پسند ہے۔ ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ کچھ لوگ اس خچر کو زین اور لگام سمیت لے آئے۔ جب میرے والد اس پر سوار ہو گئے اور اپنے کپڑے سمیٹ لیے تو انہوں نے اپنا سر آسمان کی طرف بلند کیا اور کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰہ اس پر انہوں نے کسی حرف یا لفظ کا اضافہ نہیں کیا۔ پھر فرمایا: میں نے خدا کی حمد میں سے کوئی چیز ترک نہیں کی اور حمد و سپاس کی تمام قسموں کو خدا سے مخصوص کیا ہے اور کوئی حمد و سپاس ایسی نہیں ہے جو اس جملہ میں شامل نہ ہو۔"[1]

---

[1] تفسیر برہان۔ جلد ۱ صفحہ ۲۹۔ اصول کافی باب الشکر صفحہ ۳۵۶ میں بھی اس سے ملتی جلتی روایت نقل کی گئی ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی یہ نقل کیا گیا ہے کہ خدا کوئی بڑی یا چھوٹی نعمت اپنے بندے کو نہیں دیتا بجز اس کے کہ وہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہہ کر اس کی تمام نعمتوں کا شکر بجالاتا ہے۔[1]

(۲) حمد کے خدا کی ذات سے مخصوص ہونے کے بارے میں دوسری دلیل یہ ہے کہ ہر ممکن کے لیے ــــ خواہ اس کا تعلق عقول۔ نفوس اور ارواح سے ہو یا اجساد سے ہو ــــ پہلا کمال اس کا وجود اور ہستی ہے ــــ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کمال خدا کی جانب سے ہے کیونکہ تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا وہی ہے۔

ہر موجود کا دوسرا کمال اس کے وہی امتیازات اور خصوصیات ہیں جو اس کی عظمت اور قابلیت کا موجب ہیں اور یہ امتیازات کبھی اختیاری ہوتے ہیں اور کبھی غیر اختیاری۔ پس جو کچھ مخلوق کے اختیار سے باہر ہے وہ بلاشبہ پروردگار عالم کا فعل ہو گا مثلاً نباتات کی نشو و نما، حیوانات کو فائدے اور نقصان کا ادراک اور انسانوں کی بولنے اور اپنے مقاصد بیان کرنے کی قوت۔

جو اوصاف انسان نے اپنے اختیار کے ساتھ حاصل کیے ہیں ان کی مراجعت بھی خدا ہی کی جانب ہوتی ہے کیونکہ وہ خدا ہی ہے جس نے راہِ راست کی طرف اس کی ہدایت فرمائی ہے۔

جملہ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میں بھی اسی حقیقت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

---

[1] اصول کافی۔ باب الشکر۔ صفحہ ۳۵۶۔

جو نیک افعال خدا سے صادر ہوتے ہیں ان میں سے کوئی بھی خود اس کے لیے نہیں ہوتا کیونکہ وہ کامل مطلق ہے اور ارتقا کو اس سے منسوب کرنے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ پس جو کچھ وہ کرتا ہے وہ محض احسان اور خالص انعام ہے جس کا فائدہ مخلوقات کو پہنچتا ہے لیکن جو نیک کام بعض افراد انجام دیتے ہیں اگرچہ کبھی کبھی ان کا فائدہ ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی پہنچتا ہے تاہم پہلے مرحلے میں ایک نیک کام کا فائدہ خود اس شخص کو پہنچتا ہے جو اسے انجام دیتا ہے کیونکہ وہ اپنا کمال اس کام کی انجام دہی میں سمجھتا ہے اور اسی لیے اسے انجام دیتا ہے۔

قرآن مجید اس بارے میں فرماتا ہے:

"اگر تم نیکی کرو گے تو اس میں خود تمہارے ہی لیے بہتری ہو گی[1]"

پس محض احسان اور خالص نیکی جس کا فائدہ فقط دوسروں کو پہنچے صرف خدا کا کام ہے اس لیے بس وہی حمد و سپاس کے لائق ہے کوئی اور نہیں۔ جملہ "اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ" میں بھی اسی حقیقت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

ہم یہاں اس نکتے کا اضافہ بھی کرنا چاہتے ہیں کہ نیک کاموں کے لیے حمد و ثنا بعض اوقات اس بنا پر ہوتی ہے کہ حمد و ثنا کرنے والا احسان کرنے والے کے نیک کاموں کی قدر و قیمت یا اس کی بلند اور قابل ستائش صفات کو سمجھ جاتا ہے حالانکہ اسے اس کے انعام اور احسان کی کوئی تمنا نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ اس سے ڈرتا ہے۔ حقیقت کی یہی سوجھ بوجھ اور شناخت

---

[1] سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۷

اسے حمد وسپاس پر آمادہ کرتی ہے۔ بعض اوقات یہ حمد وثنا اس ہستی سے انعام کی امید یا احسان کی خواہش کے تحت یا خوف کی وجہ سے بھی کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حمد وسپاس کے محرک مختلف ہوتے ہیں۔ اس سورت میں حمد کی ان چاروں وجوہ اور محرکات کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی ہے کہ خدائے واحد ہر جہت سے حمد وسپاس کا سزاوار ہے۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے جملے میں خدا کے ذاتی کمال اور لیاقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو کہ حمد وسپاس کا پہلا محرک ہے۔ نیز یہ بتایا گیا ہے کہ اس کی ذاتِ اقدس کمال کی تمام صفات رکھتی ہے اور تمام عیوب اور نقائص سے پاک اور مبرا ہے اور اس کے نتیجے میں فطری طور پر ہر قسم کی حمد وثنا کے لائق ہے۔

جملہ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میں حمد کا دوسرا محرک بیان کیا گیا ہے یعنی—— تمام موجودات کی تخلیق—— وجود اور ہستی کی نعمت، روحانی اور جسمانی تربیت، نشوونما اور پرورش کے تمام عوامل خدا کی طرف سے ہیں اور اس تمام احسان اور نیکی کے لیے اس کی حمد وثنا کرنی چاہیے۔

جملہ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ حمد اور سپاس کا تیسرا محرک ہے اور کہتا ہے: چونکہ خدائے رحمٰن ورحیم رحمت کا سرچشمہ ہے اس لیے اس کے احسان، نیکیوں اور لطف وکرم کا امیدوار رہنا چاہیے اور اس کے احسان اور عنایتوں کی اس توقع اور امید کا تقاضا ہے کہ اس کی حمد وثنا کی جائے۔

اس نکتے پر توجہ دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ حمد میں "اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" کی آیت تکرار یا تاکید کی غرض سے نہیں آئی بلکہ پہلے مرحلے میں (یعنی آیۂ بسملہ میں) ثواب اور برکت کے لیے اور دوسرے مرحلے میں حمد اور سپاس کی وجہ

بیان کرنے کے لیے آئی ہے۔

جملہ "مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ" حمد اور سپاس کا چوتھا محرک ہے جو انسان کو اس حقیقت کی جانب متوجہ کرتا ہے کہ تمام اعمال اور امور اور تمام انسانوں کو بالآخر خدا کی طرف لوٹنا ہے۔ روزِ قیامت کی سلطنت اور حکومت اسی کی اور اعمال کا حساب کتاب اور ان کی جزا و سزا بھی اسی کے ہاتھ میں ہے لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ اس سے ڈریں، اس کی نافرمانی سے پرہیز کریں اور اس کی حمد و ثنا کے ساتھ ساتھ شکر ادا کریں۔

ایک اور بیان کے مطابق "مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ" اور "صاحبِ روزِ جزا" سے مراد یہ ہے کہ وہ خدا کے عدل و انصاف اور بخشش و عطا کا دن ہے۔ چونکہ یہ دو صفتیں یعنی عدل اور بخشش جن سے اس دن لوگ مکمل طور پر بہرہ مند ہوں گے جمال اور عظمت کی صفتیں ہیں اس لیے لازم ہے کہ ان دو صفتوں کے لیے خدا کی تعریف اور حمد و ثنا کی جائے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ وہ عنایات کے لیے حمد و ثنا کے لائق ہے جو وہ اس دنیا میں انسانوں پر کرتا ہے۔

آیۂ استعانت کی تشریح

اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ○

لغات اور مفردات

عِبَادَت: لغت میں اس لفظ کے تین معنی بتائے گئے ہیں:

(۱) بعض اوقات اس کے معنی اطاعت اور فرمانبرداری کے ہوتے ہیں مثلاً
"اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَیْكُمْ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ○ [۱]"
اے اولادِ آدمؑ! کیا میں نے تمہیں یہ نہیں کہا تھا کہ شیطان کی اطاعت نہ کرنا کیونکہ وہ تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے۔

(۲) اس کے دوسرے معنی خضوع، تذلل اور ذلت کے ہیں مثلاً

---

[۱] سورۂ یٰسین۔ آیت ۶۰

"فَقَالُوٓا اَنُؤۡمِنُ لِبَشَرَيۡنِ مِثۡلِنَا وَقَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ"[1]

پس انہوں نے کہا: کیا ہم ان دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں حالانکہ وہ ہمیں جیسے ہیں اور ان کی قوم ہمارے سامنے حقیر اور ذلیل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جس راستے پر آمد و رفت زیادہ ہو اور راہگیروں کے قدم اس پر زیادہ پڑیں اسے معبد کہا جاتا ہے

(۳) بعض اوقات یہ لفظ پرستش کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً

"قُلۡ اِنَّمَآ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشۡرِكَ بِهٖ"[2]

کہہ دیجیے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں خدا کی پرستش کروں اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤں۔

لفظ عِبادَت اکثر و بیشتر انہیں معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور اگر وہ کسی علامت، قید اور شرط کے بغیر استعمال ہو تو لوگ اس کے یہی معنی لیتے ہیں۔

لفظ عَبۡد کے بہت سے معنیٰ ہیں۔ بعض اوقات یہ مطلقاً انسان کے لیے استعمال ہوتا ہے اگرچہ وہ آزاد ہو کیونکہ خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کی پرورش اور تربیت کی ہے لہٰذا وہ فطری طور پر اس کے آگے فروتن ہوتا ہے، اگرچہ یہ ممکن ہے کہ خدا جو کام کرنے کا حکم دے اور جن کاموں سے منع کرے انسان ان کے بارے میں سرکشی اختیار کرے۔

لفظ عَبۡد بعض اوقات غلام اور جان نثار کے معنوں میں آتا ہے،

---

[1] سورۂ مومنون۔ آیت ۴۷ [2] سورۂ رعد۔ آیت ۳۶

کیونکہ عبد مملوک ہے اور اس کا اختیار مالک کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ درحقیقت مالک سے اس کی نسبت جان نثاری کی ہوتی ہے۔

بعض اوقات لفظ "عبد" زیادہ وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے مثلاً جو شخص کسی چیز کو بے حد اہمیت دیتا ہو اور اس کے علاوہ کسی اور کی طرف توجہ نہ دیتا ہو، اسے اس چیز کا "عبد" کہا جاتا ہے۔ انہی معنوں میں حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے:

"الناس عبید الدنیا والدین لعق علیٰ ألسنتهم یحوطونه ما درت معایشهم واذا محصوا بالبلا قل الدیانون"[1]

یعنی لوگ دنیا کے بندے ہیں اور اس پر جان چھڑکتے ہیں دین کا زور شور محض ان کی زبان تک محدود ہوتا ہے چنانچہ جب تک ان کی زندگی آرام سے گزرتی رہے وہ دین کا دم بھرتے ہیں اور جب امتحان کا وقت آتا ہے تو دین دار کم ہی ہوتے ہیں۔

بعض موقعوں پر "عبد" مطیع اور فرمانبردار شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے اور مندرجہ ذیل آیت میں وہ انہیں معنوں میں آیا ہے:

"أَنْ عَبَّدتَّ بَنِي إِسْرَاءِيلَ"[2]

تم نے بنی اسرائیل کو اپنا فرمانبردار بنایا ہوا ہے جو تمہارے فرمان سے تجاوز نہیں کرتے۔

---

[1] بحار الانوار - جلد ۱۰ - صفحہ ۱۸۹

[2] سورۂ شعراء - آیت ۲۲

استعانت

استعانت مدد مانگنے کے معنوں میں ہے۔ یہ لفظ بعض اوقات بلا واسطہ اور بعض اوقات "باء" کے واسطے سے متعدی بن جاتا ہے اور دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے "اِسْتَعَنْتُهٗ" اور "اِسْتَعَنْتُ بِهٖ" یعنی میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ میرے کاموں میں میرا ساتھی اور مددگار بنے۔

اعراب اور حرکات

"اِیَّاکَ" دونوں مقامات پر مفعول ہے اور محدودیت کے معنی دینے کے لیے مقدم ہو گیا ہے اور اس آیت میں غیبت کی وضع سے خطاب کی وضع یعنی صیغۂ غائب سے صیغۂ حاضر میں منتقل ہو گیا ہے۔ اس انتقال کی وجہ (جسے "التفات" کہا جاتا ہے) دو چیزوں میں سے ایک ہو سکتی ہے۔

(۱) جو جملے اس آیت سے پہلے واقع ہوئے ہیں وہ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ خدا تمام موجودات کا مالک اور مربی ہے اور ان کی ہستی اور زندگی کے تمام کاروبار چلاتا ہے۔ یہ صفت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ تمام چیزوں اور موجودات کا علم رکھتا ہو اور سب بندوں اور ان کے اعمال اور تمام موجودات کا احاطہ کیے ہوئے ہو تاکہ وہ قیامت کے دن ان کی اطاعت کی جزا دے اور ان کے گناہوں کی سزا دے۔ اس کی یہی صفت مالکیت اور بندوں کا اس کے سامنے موجود ہونا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ خدا کی تعریف کرنے کے بعد اس کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا اظہار کریں اور اسے مخاطب قرار دیتے ہوئے کہیں:

"اِیَّاکَ نَعْبُدُ"

(۲) عبادت اور پرستش کی حقیقت بندے کا اپنے پروردگار کے سامنے فروتنی کا اظہار کرنا ہے کیونکہ وہ اس کا مربی اور سرپرست ہے اور اس کے تمام معاملات اس کے اختیار میں ہیں اور اس کا انتظام وہی چلاتا ہے جسے "ربوبیت" کہا جاتا ہے۔ ربوبیت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ مربی موجود ہوتا کہ وہ اپنے بندے کے ـــــ جسے اس نے تربیت دی ہے ـــــ تمام کاروبار کا انتظام سنبھال لے۔ عبادت کی طرح مدد طلب کرنے کے لیے بھی لازم ہے کہ مربی موجود ہو کیونکہ انسان کا خود مختار نہ ہونا خدا کی مدد اور عنایت کا محتاج ہونا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ موجود ہو تاکہ اس کی جانب سے مدد یقینی ہو جائے۔

پس عبادت اور مدد طلب کرنے کے مقام پر بندہ اپنے آپ کو غائب نہیں بلکہ خدا کے سامنے حاضر پاتا ہے اور اسی بنا پر اسے مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے: "میں فقط تیری عبادت کرتا ہوں اور تجھ ہی سے مدد مانگتا ہوں"۔

(اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ)

تفسیر

گزشتہ آیتوں کے ذریعے اپنی بڑائی اور وصف بیان کرنے کے بعد خدا اپنے بندوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس آیت کو پڑھیں اور اس کے مفہوم اور حقیقت کا اعتراف کریں یعنی یہ کہ وہ خدا کے علاوہ نہ تو کسی کی عبادت کرتے ہیں اور نہ کسی سے مدد چاہتے ہیں کیونکہ جب تک خدا کی توجہ اور عنایت ان کے شامل حال نہ ہو تمام موجودات فطری طور پر بے نوا اور عاجز

بلکہ عدم کے برابر ہیں۔ پس ایک ایسا موجود جو اپنی ہستی اور وجود کے لیے بھی دوسرے کا محتاج ہو اس قابل نہیں ہو سکتا کہ اس کی پرستش کی جائے یا اس سے مدد مانگی جائے۔ اگرچہ نقص اور کمال کے نقطۂ نظر سے تمام موجودات آپس میں متفاوت ہیں لیکن عجز اور احتیاج کی صفت میں سبھی شریک ہیں اور خدا کے حکم اور ارادے کے ماتحت ہونے کے لحاظ سے بھی برابر ہیں جیسا کہ خدا فرماتا ہے:

"یاد رکھو کہ پیدا کرنے والا اور حکم دینے والا خدا ہے۔ وہی خدا جو عالی مرتبہ اور دونوں جہاں کا پروردگار ہے[1]"

"آسمانوں اور زمین کی سلطنت خدا کی ہے اور سبھی کو اس کی طرف لوٹ کر جانا ہے[2]۔"

کون ہے جو اس کی سلطنت کی مخالفت کرے اور اس کے احکام کے بارے میں اس سے تکرار کرے جبکہ وہی دینے والا اور وہی واپس لے لینے والا ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جیسے چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔

پس ایک ایماندار شخص خدا کے علاوہ کسی کی حمد و ثنا نہیں کرتا اور اس کے علاوہ کسی سے مدد نہیں مانگتا کیونکہ خدا کے علاوہ سبھی محتاج محض ہیں اور معبود کے لیے لازم ہے کہ وہ غنی اور بے نیاز ہو ورنہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک فقیر دوسرے فقیر کی ستائش کرے؟

جو کچھ ہم نے اوپر کہا ہے اس کا لُبِ لُباب یہ ہے کہ ایمان اس امر کا متقاضی ہے کہ انسان خدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرے، اس کے

---

[1] سورۂ اعراف۔ آیت ۵۴ [2] سورۂ نور۔ آیت ۴۲

سوا کسی کے سامنے اپنی حاجت نہ لے جائے، بجز اس کے کسی دوسرے پر بھروسہ اور اعتماد نہ کرے اور اس کے علاوہ کسی سے مدد نہ مانگے ورنہ وہ دوسرے کو خدا کے ساتھ شریک کرتا ہے اور اس کی سلطنت کے ساتھ دوسرے کی حکومت کو بھی قبول کرتا ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

"تمہارے خدا نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کرو۔"[1]

---

[1] سورۂ بنی اسرائیل - آیت ۲۳

عبادت اور استعانت کی تشریح

عبادت میں توحید

ایک چیز جس میں کوئی مسلمان شک وشبہ نہیں کرسکتا وہ یہ ہے کہ عبادت (پرستش کے معنوں میں) فقط خدا کے لیے مخصوص ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے لفظ "عبادت" کے اطلاق کے موقع پر اس کے یہی معنی لیے جاتے ہیں اور عبادت کو خدا کی ذات سے مخصوص کر دینا ہی عبادت میں توحید ہے اور عبادت میں توحید بھی اصلی کامل توحید سے وجود میں آتی ہے جس کے لیے انبیاء مبعوث ہوئے اور آسمانی کتابیں نازل ہوئیں۔

(اے رسولؐ!) کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب! تم ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم خدا کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور

کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی بھی خدا کے سوا کسی کو اپنا پروردگار نہ بنائے[1]"

پس خدا پر ایمان اور اس کے علاوہ کسی دوسرے کی عبادت دو ایسی چیزیں ہیں جو اکٹھی نہیں ہو سکتیں، خواہ یہ عبادت توحید سے انکار اور بہت سے خداؤں پر اعتقاد کا نتیجہ ہو یا خالق اور مخلوق کے درمیان فاصلہ رکھنے کے عقیدے سے وجود میں آئے کیونکہ جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو وہ خیال کرتا ہے کہ خدا لوگوں سے دور ہے اور قدرتی طور پر لوگوں کی دعائیں اس تک نہیں پہنچ سکتیں۔ اسی بنا پر لوگ وسیلوں اور واسطوں کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تاکہ وہ انہیں خدا کے قریب اور نزدیک کر دیں۔ ان لوگوں کے خیال میں خدا بھی بادشاہوں کی طرح محل، فوجیں اور دیگر ساز و سامان رکھتا ہے اور انہی کی طرح اپنی رعایا یعنی بندوں سے دور رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ ایسے واسطوں اور وسیلوں کی حاجت رکھتے ہیں جو اُن کی حاجتیں بر لائیں، ان کی درخواستوں کا جواب دیں، ان کے اور اُن کے بادشاہ (خدا) کے درمیان واسطہ اور رابطہ بنیں تاہم خدا نے ان دونوں عقیدوں کو قرآن مجید میں باطل اور بے بنیاد قرار دیا ہے۔

پہلا عقیدہ

خدا نے اس عقیدے کو جس سے مراد کئی ایک خدا ہیں، باطل ثابت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

---

[1] سورۂ آل عمران - آیت ۶۴

"اگر اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو زمین اور آسمان فساد اور تباہی سے دوچار ہو جاتے[1]۔"

"اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور اگر کوئی اور خدا بھی ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو لیے پھرتا اور وہ ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ یہ لوگ (مشرکین) جو باتیں خدا سے منسوب کرتے ہیں وہ ان سے پاک اور پاکیزہ ہے[2]۔"

دوسرا عقیدہ

یہ عقیدہ واسطوں اور وسیلوں کے بارے میں ہے جو خداوندی نظام کو نوع انسان کے بادشاہوں کے نظام پر قیاس کرنے سے وجود میں آتا ہے۔ خدا اس غلط عقیدے کو اپنے مختلف ارشادات میں رد کرتا ہے۔

بعض اوقات وہ اس عقیدے کے حامیوں سے اس کا ثبوت طلب کرتا ہے اور یوں وہ ان کے ضمیر کو ان کے اس عقیدے کے بے بنیاد ہونے کی جانب متوجہ کرتا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے:

"کیا (حقیقی) خدا کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ہے؟ ان سے کہہ دیجیے کہ اگر یہ سچے ہیں تو دلیل پیش کریں[3]۔"

انہوں نے کہا: "ہم بتوں کی پرستش کرتے ہیں اور رات تک ان کے آگے سر تسلیم خم کیے رہتے ہیں[4]۔"

---

[1] سورۂ انبیاء۔ آیت ۲۲ [2] سورۂ مومنون۔ آیت ۹۱

[3] سورۂ نمل۔ آیت ۶۴ [4] سورۂ شعراء۔ آیت ۷۱

ابراہیمؑ نے کہا: "جب تم لوگ انہیں پکارتے ہو تو کیا وہ تمہاری آواز سنتے ہیں[1] یا تمہیں کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں[2]؟"

انہوں نے کہا: "نہیں! بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا کرتے دیکھا ہے اور ہم ان کی پیروی کر رہے ہیں[3]۔"

بعض اوقات قرآن مجید انہیں کوئی ایسا نکتہ سمجھاتا ہے جس سے انہیں اپنی غلطی کا خود بخود پتا چل جاتا ہے اور وہ سمجھ جاتے ہیں کہ جو کوئی نفع و نقصان پہنچانے پر قادر نہ ہو وہ عطا کرنے اور واپس لینے کی قدرت بھی نہیں رکھتا۔ وہ انہیں کوئی نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔ اس کے ہاتھ میں موت ہے نہ زندگی۔ قدرتی طور پر ایسا موجود ایک کمزور مخلوق کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا اور یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ایک سمجھدار انسان ایسی کمزور مخلوق کی پرستش کرے اور اسے اپنے خداوند کے طور پر قبول کرے۔

ابراہیمؑ نے کہا: "کیا تم خدا کو چھوڑ کر ایسی چیز کی پرستش کرتے ہو جو تمہیں کوئی نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتی[4]؟"

"تف ہے تم پر اور اس چیز پر جسے تم خدا کے سوا پوجتے ہو[5]۔"

"ان سے کہہ دیجیے کہ کیا تم خدا کو چھوڑ کر ایسی چیز کی پرستش کرتے ہو جو تمہیں کوئی نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتی[6]۔"

---

[1]، [2] اور [3] سورۂ شعراء - آیت ۷۲ - ۷۳ - ۷۴ -

[4] اور [5] سورۂ انبیاء - آیت ۶۶ - ۶۷

[6] سورۂ مائدہ - آیت ۷۶

"کیا وہ یہ نہیں دیکھ رہے تھے کہ وہ (بچھڑا) ان سے بات نہیں کرتا اور جو راستہ انہوں نے اختیار کیا ہے اس میں انکی رہنمائی نہیں کرتا۔ وہ اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے[1]"

یہ حقیقت کہ مخلوق ہرگز پرستش کے قابل نہیں ہے، ایک واضح عقلی اور فطری قانون ہے۔ ان آیات میں خدا چاہتا ہے کہ لوگوں کے ذہنوں کو اس فطری قانون کی جانب متوجہ کرے۔ یہ قانون اتنا عام ہے کہ اس کا اطلاق انبیاءؑ پر بھی ہوتا ہے اور ان کی بھی پرستش نہیں کی جا سکتی جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے:

"جب خدا نے کہا: اے عیسیٰ ابن مریمؑ! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ "تم خدا کو چھوڑ کر مجھے اور میری ماں کو خدا بنا لو؟"

(عیسیٰؑ نے) کہا: سبحان اللہ! میری یہ مجال نہیں کہ میں ایسی بات منہ سے نکالوں جس کا مجھے حق نہ ہو اور اگر میں یہ بات کہتا تو تجھے ضرور علم ہوتا کیونکہ تو میرے دل کے بھید جانتا ہے لیکن میں تیرے اسرار سے بے خبر ہوں، کیونکہ تو ہی غیب کی باتیں جانتا ہے۔ تو نے مجھے جو حکم دیا اس کے سوا میں نے ان سے کچھ نہیں کہا، بلکہ یہی کہا کہ خدا کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے[2]"

بعض اوقات قرآن مجید نے "وساطت" کے عقیدے کو یہ کہہ کر رد کیا

---

[1] سورۂ اعراف۔ آیت ۴۸ [2] سورۂ مائدہ۔ آیات ۱۱۶ - ۱۱۷

ہے کہ خدا اپنے بندوں کے اتنا نزدیک ہے کہ ان کی خفیہ باتیں بھی سنتا ہے اور ان کے جواب دیتا ہے اور براہِ راست ان کی تربیت اور انکے معاملات کا انتظام کرتا ہے۔ اس بنا پر اسے مددگاروں اور واسطوں کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"ہم اُس (انسان) کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں[1]۔"

"کیا خدا اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے[2]۔"

"تم مجھے پکارو۔ میں تمہیں جواب دوں گا[3]۔"

"وہی غالب اور فتح مند اور اپنے بندوں سے برتر اور وہی حکمت والا اور جاننے والا ہے[4]۔"

(اے رسولؐ!) "ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے خواہ تم اسے چھپاؤ یا ظاہر کرو، خدا اسے جانتا ہے کیونکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اسے جانتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے[5]۔"

"اگر خدا تجھے کسی ضرر سے دوچار کرے تو اس کے سوا اسے دور کرنے والا کوئی نہیں اور اگر وہ تمہارے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرے تو کوئی اس کے فضل کو پلٹنے والا نہیں[6]۔"

---

[1] سورۂ قٓ - آیت ۱۶
[2] سورۂ زمر - آیت ۳۶
[3] سورۂ مومن - آیت ۶۰
[4] سورۂ انعام - آیت ۱۸
[5] سورۂ آل عمران - آیت ۲۹
[6] سورۂ یونس - آیت ۱۰۷

"اگر وہ تمہیں فائدہ پہنچانا چاہے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔"[1]

"خدا جس کے لیے چاہے روزی بڑھا دیتا ہے اور جس کے لیے چاہے تنگ کر دیتا ہے۔"[2]

"بلاشبہ خدا روزی دینے والا، زور آور اور زبردست ہے۔"[3]

"کوئی چیز اس کی مانند نہیں اور وہی سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔"[4]

"جان لو کہ وہ یقیناً ہر چیز پر حاوی ہے۔"[5]

ان آیات سے جس چیز کا بالعموم پتا چلتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا اپنی مخلوقات سے جدا اور دور نہیں ہے اور ان کے معاملات سے دستبردار نہیں ہوا بلکہ ان کی زندگی کا تمام کاروبار اس کے دستِ قدرت سے چلتا ہے اور بندوں کو اپنے اور خدا کے درمیان واسطوں کی ضرورت نہیں کہ وہ ان کے ذریعے سے اپنی حاجتیں پروردگار تک پہنچائیں اور اس کے نتیجے میں وہ واسطے عبادت اور پرستش کے معاملے میں خدا کے ساتھ شریک اور حصہ دار بنیں۔ بلاشبہ خدا ہر جگہ موجود ہے اور ہر ایک کے ساتھ ہے اور اسے ایسے مددگاروں اور واسطوں کی ضرورت نہیں کہ جو اس کے ساتھ ساتھ قابلِ ستائش ہوں چنانچہ وہ اس بارے میں یوں ارشاد فرماتا ہے:

"تین آدمیوں میں خفیہ مشورہ نہیں ہوتا بجز اس کے کہ خدا

---

[1] سورۂ انعام۔ آیت ۱۷ — [2] سورۂ رعد۔ آیت ۲۶

[3] سورۂ ذاریات۔ آیت ۵۸ — [4] سورۂ شوریٰ۔ آیت ۱۱

[5] سورۂ حٰم سجدہ۔ آیت ۵۴

ان کا چوتھا ہوتا ہے اور پانچ آدمیوں میں مشورہ نہیں ہوتا بجز اس کے کہ ان کا چھٹا خدا ہوتا ہے اور وہ اس سے کم ہوں یا زیادہ مگر وہ جہاں کہیں بھی ہوں خدا ضرور ان کے ساتھ ہوتا ہے[1]۔"

"اسی طرح " خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے[2]"۔

" بلاشبہ خدا اپنے ارادے اور مرضی کے مطابق حکم دیتا ہے[3]"۔

خلاصہ

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ عبادت اور پرستش خدا سے مخصوص ہے، خدا کے سوا کسی اور کی عبادت خواہ وہ کسی شکل، کسی عنوان یا کسی بھی خیال سے ہو، ناجائز ہے۔ اسی عقیدے اور سوچنے کے اسی انداز کی بنا پر اہلِ توحید اور خدا پرست، مشرکوں اور غیر موحد افراد سے جدا ہو جاتے ہیں کیونکہ جو شخص خدا کے علاوہ کسی اور کی ستائش کرتا ہے وہ لازماً اسے اپنا معبود سمجھتا ہے اور جو کوئی خدا اور معبودِ حقیقی کے سوا کسی اور کو اپنا معبود بناتا ہے وہ کافر یا مشرک ہو جاتا ہے۔

عبادت اور اطاعت

اس میں شک نہیں کہ عقل کی رو سے خدا کی اطاعت ہر شخص پر واجب

۱؎ سورۂ مجادلہ - آیت ۷ ۲؎ سورۂ آل عمران - آیت ۴۰

۳؎ سورۂ مائدہ - آیت ۱

ہے اور اس سے سرتابی کرنا عذاب کا موجب ہے۔ قرآن مجید میں بھی خدا نے اطاعت کرنے والوں کے لیے اجرِ عظیم کا وعدہ کیا ہے اور بغاوت کرنے والوں کو اپنے عذاب کا خوف دلایا ہے۔

خدا کے علاوہ کسی دوسرے کی اطاعت کرنے کی کئی قسمیں ہیں۔ وہ کبھی واجب، کبھی حرام اور کبھی مباح ہوتی ہے:

(۱) کبھی خدا کے علاوہ کسی دوسرے کی اطاعت خود خدا کے حکم سے انجام پاتی ہے مثلاً رسولِ اکرمؐ اور ان کے اوصیاءؑ کی اطاعت۔ اس قسم کی اطاعت درحقیقت خدا کی اطاعت ہوتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس قسم کی اطاعت پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا بلکہ عقل کی رو سے یہ واجب اور لازم ہوتی ہے چنانچہ خدا کا ارشاد ہے:

"جو شخص پیغمبرؐ کی اطاعت کرے وہ بلاشبہ خدا کی اطاعت کرتا ہے[۱]۔"

"ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا سوائے اس کے کہ لوگ خدا کے حکم سے اس کی اطاعت کریں[۲]۔"

یہی وجہ ہے کہ خدا جہاں کہیں اپنی اطاعت کا حکم دیتا ہے اس کے ساتھ ساتھ اپنے پیغمبر کی اطاعت کا ذکر بھی کرتا ہے:

"جو شخص خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے وہ بڑی نیک بختی حاصل کر لیتا ہے[۳]۔"

---

[۱] سورۂ نساء - آیت ۸۰ [۲] سورۂ نساء - آیت ۶۴

[۳] سورۂ احزاب - آیت ۷۱

"اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول ص کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی جو تم میں سے تمہارے ولی الامر ہوں۔"[1]

(۲) بعض اوقات غیرِ خدا کی اطاعت سے خدا منع فرماتا ہے مثلاً شیطان کی یا ان لوگوں کی اطاعت جو انسان کو گناہ اور خدا کی مخالفت پر اُکسائیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قسم کی اطاعت شریعت کی رو سے حرام اور عقل کے نقطۂ نگاہ سے ایک بُرا اور ناشائستہ فعل ہے اور بعض اوقات کفر اور شرک کی سرحد کو چھو لیتا ہے مثلاً یہ کہ کوئی شخص کسی انسان کو کفر اور شرک کا مرتکب ہونے کا حکم دے اور وہ بھی اس کی اطاعت کرے اور اس بارے میں اس کی بات مان لے جیسا کہ خدا فرماتا ہے:

"اے پیغمبر ص! خدا سے ڈرو اور کافروں اور منافقوں کی اطاعت نہ کرو[2]۔"

"اطاعت کے راستے میں اپنے خدا کے حکم کے لیے صبر کرو اور ان لوگوں میں سے گنہگاروں اور ناشکروں کی اطاعت نہ کرو[3]۔"

"اگر وہ (ماں باپ) تمہیں اس بات پر مجبور کریں کہ تم اس چیز کو میرا شریک قرار دو جس کا تمہیں کوئی علم نہیں تو تم ان کی اطاعت نہ کرو[4]۔"

---

[1] سورۂ نساء - آیت ۵۹
[2] سورۂ احزاب - آیت ۱
[3] سورۂ دہر - آیت ۲۴
[4] سورۂ لقمان - آیت ۱۵

(۳) بعض اوقات انسان خدا کے علاوہ کسی اور کی اطاعت کرتا ہے جبکہ خدا کی طرف سے اسے یہ فعل انجام دینے یا نہ دینے کے بارے میں کوئی حکم نہیں ملا ہوتا۔ اس قسم کی اطاعت نہ حرام ہے اور نہ واجب بلکہ ایک جائز اور مباح عمل ہے۔

پرستش اور فروتنی میں فرق

اس میں کوئی شک نہیں کہ مخلوق کو چاہیے کہ اپنے خالق کے سامنے فروتنی اختیار کرے اور عاجزی اور بندگی کا اظہار کرے۔ یہ ایک ایسی مسلمہ حقیقت ہے جس کی عقل اور شریعت دونوں گواہی دیتی ہیں اور جسے ثابت کرنے کے لیے کسی دلیل اور برہان کی حاجت نہیں۔

اطاعت کی طرح مخلوق کے سامنے فروتنی اور عاجزی کے اظہار کی بھی چند قسمیں ہیں:

(۱) بعض اوقات انسان مخلوق کے سامنے فروتنی اور انکساری کا اظہار کرتا ہے بغیر اس کے کہ وہ اس مخلوق کے لیے خدا کی جانب سے اس کے کسی خاص مقام اور منصب پر اعتقاد رکھتا ہو اور یہ اعتقاد اور احساس اسے اس احترام اور فروتنی کے لیے آمادہ کرے بلکہ یہ فقط رسمی تعظیم اور احترام شمار ہوتا ہے جیسے کہ اولاد کا والدین کے سامنے اور شاگرد کا استاد کے سامنے فروتنی کا اظہار کرنا اور اسی قسم کا احترام جو لوگوں میں بالعموم رائج ہے۔

اس قسم کی تعظیم اور فروتنی بلاشبہ جائز ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں بجز اس کے کہ شارع کی جانب سے اس کی ممانعت کی گئی ہو مثلاً

خدا کے علاوہ کسی اور کو سجدہ کرنا جو شرعاً ممنوع اور حرام ہے۔ اگر یہ صورت نہ ہو تو ایسی فروتنی اور تعظیم کی تمام قسمیں قطعاً جائز ہیں اور ان میں کوئی اشکال نہیں اور ان میں سے شرک کی بو نہیں آتی جیسا کہ خدا فرماتا ہے:

"ان (والدین) کے لیے مہر و محبت سے فروتنی کے بال و پر پھیلائے رکھو اور ان کے حق میں دعا کرو کہ اے پروردگار! جس طرح ان دونوں نے میرے بچپنے میں میری پرورش کی ہے اسی طرح تو بھی ان پر رحم فرما[1]"

آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ خدا نے اس آیت میں والدین کے سامنے فروتنی اور انکساری کا حکم دیا ہے حالانکہ اس سے پہلی آیت میں اس نے اپنے علاوہ دوسرے کی عبادت سے منع کیا ہے اور یوں ارشاد فرمایا ہے:

"تمہارے پروردگار نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی دوسرے کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ سے نیکی کرو[2]"

کیا عاجزی اور انکساری کے اظہار کے طور پر "پروں کا پھیلانا" (جیسا کہ چھوٹے پرندے پھیلاتے ہیں) اسی احسان اور نیکی کا جزو نہیں ہے جس کا اس آیت میں حکم دیا گیا ہے اور جسے خدا کی عبادت کا ہم پلہ قرار دیا گیا ہے؟ کیا اس آیت میں یہ پتا نہیں چلتا کہ خدا کے علاوہ دوسرے کے سامنے ہر فروتنی اور ذلت کا اظہار شرک نہیں ہے؟

(۲) یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اوقات انسان یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ ایک دوسرے

---

[1] سورۂ بنی اسرائیل - آیت ۲۴ [2] سورۂ بنی اسرائیل - آیت ۲۳

انسان کو خدا نے کوئی مخصوص مقام اور منصب عطا کیا ہے اور اس اعتقاد اور احساس کی بنا پر وہ اس کے سامنے فروتنی اور انکساری کا اظہار کرے لیکن ایسا عقیدہ باطل ہوتا ہے اور یہ فروتنی اور خاکساری خدا کے اذن کے بغیر انجام پاتی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ جھوٹے مذاہب کے پیرو اپنے رہبروں اور پیشواؤں کے سامنے فروتنی اور انکساری کا اظہار کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قسم کی فروتنی اور خاکساری کی نوعیت خدا پر افترا باندھنے اور دین میں بدعت پیدا کرنے کی ہے اور چاروں شرعی دلائل یعنی قرآن، سنت، عقل اور اجماع کے مطابق حرام اور ممنوع ہے جیسا کہ خدا فرماتا ہے:

"جو شخص خدا پر بہتان باندھے اور جھوٹی بات اس سے منسوب کرے، اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا[1]"

(۳) بعض اوقات انسان کسی دوسرے انسان کے سامنے فروتنی کا اظہار کرتا ہے لیکن وہ خدا کے اذن سے ایسا کرتا ہے مثلاً رسول اکرمؐ اور ان کے اوصیاءؑ کے سامنے ادب اور خاکساری کا اظہار یا ہر مومن شخص کے ساتھ فروتنی سے پیش آنا یا ہر اس چیز کا احترام کرنا جو خدا سے منسوب ہو اور اس نسبت کی بنا پر اس نے مقام اور منزلت حاصل کر لی ہو مثلاً قرآن، مسجد اور حجرِ اسود وغیرہ جو خدا سے منسوب ہیں۔

اس قسم کی فروتنی اور انکساری کا اظہار نہ صرف یہ کہ توحیدِ الٰہی کے

---

[1] سورہ کہف۔ آیت ۱۵

منافی نہیں اور اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ خدا کی نگاہ میں یہ بے حد محبوب اور پسندیدہ ہے جیسا کہ وہ ارشاد فرماتا ہے:

"خدا جلد ہی ان لوگوں کو لائے گا جنہیں وہ دوست رکھتا ہے اور وہ بھی خدا کو دوست رکھتے ہیں۔ وہ لوگ مومنوں کے ساتھ تذلل اور تواضع سے پیش آتے ہیں اور کفار کے مقابلے میں فولاد کی طرح سخت ہوتے ہیں۔[1]"

بلاشبہ ایسی فروتنی اور عاجزی جو خدا کے حکم سے ہو در حقیقت خدا ہی کے سامنے فروتنی اور عاجزی ہے اور اس کی بارگاہ میں عبودیت اور بندگی کا اظہار ہے، کیونکہ اگر ایک شخص خدا کی خالص توحید پر ایمان رکھتا ہو اور اس بات کا معتقد ہو کہ زندہ کرنا اور مارنا، پیدا کرنا اور روزی دینا، تنگی اور فراخی دینا، معاف کرنا اور سزا دینا سب اس کے اختیار میں ہے اور یہ اعتقاد بھی رکھتا ہو کہ رسول اکرمؐ اور ان کے جانشین بھی اس کے بندے ہی ہیں لیکن ایسے معزز بندے ہیں کہ جو گفتار میں اس پر سبقت لے جانے کی کوشش نہیں کرتے اور اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اگر ایسا شخص اپنے پاک عقیدے کے ساتھ خدا ہی کے حکم سے انہیں (یعنی رسول اکرمؐ اور ان کے جانشینوں کو) بارگاہِ الٰہی میں تقرب کا وسیلہ اور اپنا شفیع قرار دے اور وہ بھی خدا کے اذن کے ساتھ تو وہ ایمان کے دائرے سے خارج نہیں ہوتا اور نہ خدا کے علاوہ کسی کی پرستش کرتا ہے اس لیے اسے شرک سے منسوب نہیں کرنا چاہیے۔

ہر مسلمان جانتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ احترام کے طور پر حجرِ اسود کو بوسہ دیتے

---

[1] سورۂ مائدہ۔ آیت ۵۴

تھے اور اسے اپنے سے مس کرتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ مومنین شہداء اور صالحین کی قبروں کی زیارت کے لیے بھی تشریف لے جاتے تھے۔ قبروں کے سامنے کھڑے ہو کر ان میں مدفون اشخاص کو سلام کہتے اور ان کے حق میں دعا فرماتے تھے۔

آنحضرتؐ کے صحابہ اور بعد کے ادوار کے مسلمانوں نے بھی یہی طریقہ اپنایا۔ وہ رسولِ اکرمؐ کے روضہ مبارک کی زیارت کرتے اور اسے بوسہ دیتے تھے۔ وہ رسولِ اکرمؐ کے دورِ حیات کی طرح ان کے وصال کے بعد بھی بارگاہِ خداوندی میں ان کی شفاعت کے خواستگار ہوتے تھے۔ پیشوایانِ دین اور صالح بندوں کی قبروں کے بارے میں بھی ان کا طرزِ عمل ایسا ہی تھا۔

رسولِ اکرمؐ کے صحابہ اور علماء میں سے کسی نے بھی اس قسم کے اعمال سے نہ تو انکار کیا اور نہ ہی ان کی مخالفت کی حتیٰ کہ احمد بن عبدالحلیم حرانی ظاہر ہوا جو ابن تیمیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے قبروں کی زیارت کے لیے سفر کرنے، ان پر ہاتھ پھیرنے، انہیں چومنے اور صاحبانِ قبور کو اپنا شفیع ٹھہرانے کو حرام قرار دیا حتیٰ کہ اس نے ان لوگوں کی بھی شدید مخالفت کی جو رسولِ اکرمؐ کی قبر کو بوسہ دیتے اور اسے مس کر کے برکت طلب کرتے تھے۔ اس نے ان اعمال کو کبھی شرکِ اصغر اور کبھی شرکِ اکبر یعنی سب سے بڑا شرک ٹھہرایا۔

ابن تیمیہ کے معاصر علماء اور اسکالروں نے اس کے عقائد کو پرکھا اور دیکھا کہ وہ دین اسلام کے بدیہیات اور مسلمات کی مخالفت کر رہا ہے اور جو کچھ اسلام میں ثابت ہو چکا ہے وہ اس سے انکار کر رہا ہے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ لوگوں کو قبروں اور بالخصوص رسولِ اکرمؐ کی قبر کا شوق اور ترغیب دلانے کے لیے بہت سی روایات آنحضرتؐ سے نقل کی گئی ہیں۔ ان میں سے

ایک روایت کے مطابق رسول اکرمؐ نے فرمایا:

"اگر کوئی شخص میری وفات کے بعد میری (قبر کی) زیارت کرے تو ایسا ہی ہے جیسے اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی ہو[1]"

---

[1] قبروں کی زیارت کے جائز ہونے کے بارے میں اتنی زیادہ روایات نقل کی گئی ہیں کہ ہمیں یہاں نقل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ پھر بھی یہاں ہم فقط وہ روایتیں درج کریں گے جو احمد بن عبدالحلیم معروف بہ ابن تیمیہ کے پوتے عبدالسلام بن عبداللہ نے کتاب "المنتقیٰ من اخبار المصطفیٰؐ" میں نقل کی ہیں۔ ان کے علاوہ ہم ان پر دوسرے لوگوں کی بیان کردہ چند روایات کا اضافہ بھی کریں گے۔

عبدالسلام بن عبداللہ فرزند ابن تیمیہ۔

(۱) بریدہ سے نقل کرتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: میں تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کرتا تھا لیکن خدا نے محمدؐ کو اس کی والدۂ گرامی کی قبر کی زیارت کرنے کی اجازت دی ہے۔ پس قبروں کی زیارت کیا کرو کیونکہ قبروں کی زیارت قیامت کے دن کو یاد رکھنے کا ایک ذریعہ ہے۔

(۲) ابوہریرہ سے نقل کرتا ہے کہ: رسول اکرمؐ نے اپنی والدۂ گرامی کی قبر کی زیارت کی، وہاں گریہ فرمایا اور ان لوگوں کو بھی رلادیا جو آپ کے ارد گرد موجود تھے۔ پھر فرمایا: میں نے خداوند کریم سے اجازت مانگی کہ میں اپنی والدۂ گرامی کے لیے استغفار کروں اور ان کے لیے مغفرت طلب کروں لیکن اس نے مجھے اجازت نہ دی۔ میں نے باردیگر اجازت مانگی چنانچہ خدا نے میری درخواست قبول کی اور مجھے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کرنے کی اجازت دیدی۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

یہی وجہ ہوئی کہ جب علماء نے دیکھا کہ ابن تیمیہ صریح روایات کی مخالفت کر رہا ہے تو انہوں نے اس سے بیزاری کا اظہار کیا اور اس کے گمراہ ہو جانے

(پچھلے صفحہ سے آگے) پس قبروں کی زیارت کیا کرو کیونکہ قبروں کی زیارت موت کی یاد دلاتی ہے
(۳) عبداللہ بن ابی ملیکہ سے روایت کرتا ہے: عائشہ ایک دن قبرستان کی جانب سے آرہی تھیں میں نے انہیں کہا: اے ام المومنین آپ کہاں سے آرہی ہیں؟ انہوں نے کہا میں اپنے بھائی عبدالرحمن کی قبر کی زیارت کر کے آرہی ہوں۔ میں نے کہا: کیا رسول اللہ نے قبروں کی زیارت کو حرام قرار نہیں دیا؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ رسول اکرمؐ نے قبروں کی زیارت کرنے سے منع فرمایا تھا لیکن بعد میں انہوں نے قبروں کی زیارت کا حکم دیا اور سفارش کی۔

ابن تیمیہ یہ روایت نقل کرنے کے بعد کہتا ہے: یہ روایت اثرم نے بھی اپنی سنن میں نقل کی ہے۔

مؤلف:

یہ روایت فقط ابن تیمیہ اور اثرم نے ہی نقل نہیں کی بلکہ شیخ محمد حامد فقی کتاب المنتقیٰ پر اپنے تحریر کردہ حاشیے میں کہتے ہیں کہ یہ روایت ابن ماجہ، حاکم نیز بغوی نے بھی شرح السنہ میں درج کی ہے۔

(۴) ابوہریرہ سے مزید نقل کرتا ہے کہ رسول اکرمؐ قبرستان میں آئے اور وہاں یوں ارشاد فرمایا: اے مومنو! تم پر سلام ہو۔ عنقریب ہم بھی تمہارے ساتھ آملیں گے

ابن تیمیہ یہ روایت نقل کرنے کے بعد پھر کہتا ہے کہ: یہ روایت احمد، مسلم اور نسائی نے بھی نقل کی ہے اور احمد نے عائشہ سے بھی یہ روایت نقل کی ہے لیکن عائشہ کی روایت میں اس جملے کا اضافہ کیا ہے کہ رسول اکرمؐ نے یہ دعا کی: اے پروردگار! ہمیں ان کے اجر اور صلے سے محروم نہ رکھ۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

کے بارے میں فتویٰ دیا اور کہا کہ جب تک وہ اپنے اقوال اور عقائد سے توبہ نہ کرے اسے قید میں رکھا جائے۔

(پچھلے صفحہ سے آگے) اور ان کے بعد ہمیں ایسی آزمائش میں نہ ڈال جس سے ہم عہدہ برآ نہ ہو سکیں۔

(۵) بریدہ سے مزید نقل کرتا ہے کہ: رسول اکرمؐ اپنے اصحاب کو تعلیم دیتے تھے کہ جب وہ قبروں کی زیارت کے لیے جائیں تو ان میں سے ایک شخص کہے: اے مُردوں کے ملک میں رہنے والو! تمہیں مومنوں اور مسلمانوں کا سلام پہنچے۔ جب خدا نے چاہا ہم بھی تم سے آملیں گے۔ خدا ہمیں، تمہیں اور سب کو فلاح و صلاح عنایت فرمائے۔

ابن تیمیہ یہ روایت نقل کرنے کے بعد کہتا ہے کہ احمد، مسلم اور ابن ماجہ نے بھی یہ روایت اپنی کتابوں میں درج کی ہے۔ (المنتقیٰ۔ جلد ۲۔ صفحہ ۱۱۶)

(۶) ابن عمر نے رسول اکرمؐ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: جو شخص خانۂ خدا کی زیارت کرے اور اس کے بعد میری قبر کی زیارت کرے وہ ایسے شخص کی مانند ہے جس نے میری زندگی میں میری زیارت کی ہو۔ یہ روایت طبرانی نے اوسط میں اور بیہقی نے اپنی سنن میں بیان کی ہے۔

(۷) رسولِ اکرمؐ سے یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا: جو شخص میری قبر کی زیارت کرے گا میں بھی یقیناً اس کی شفاعت کروں گا۔

یہ روایت ابن عدی نے "کامل" میں اور بیہقی نے اپنی سنن (فصل شعب ایمان) میں نقل کی ہے۔

(۸) انس نے رسول اکرمؐ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: (باقی اگلے صفحہ پر)

جس چیز سے ابن تیمیہ کو غلط فہمی ہوئی (اگر ہم یہ نہ کہیں کہ اس نے یہ کام جان بوجھ کر کیا اور اس کا مقصد مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا کرنا تھا) وہ یہ تھی کہ اس نے خیال کیا کہ یہ اعمال خدا کے علاوہ کسی اور کی پرستش

(پچھلے صفحہ سے آگے) جو شخص میری وفات کے بعد مدینے میں میری زیارت کرے گا میں بھی قیامت کے دن اس کے اعمال پر نگاہ رکھوں گا اور اس کی شفاعت کروں گا۔
(سنن بیہقی، فصل شعب ایمان اور کنز العمال۔ جلد ۸۔ صفحہ ۹۹)

(۹) ابو ہریرہ نے رسول اکرمؐ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: کوئی شخص اپنے رشتہ دار کی قبر کی زیارت نہیں کرتا کہ اسے سلام کہے اور اس کی قبر کے پاس تھوڑی دیر بیٹھے۔ مگر یہ کہ صاحب قبر اس کے سلام کا جواب دیتا ہے اور اسے پہچان لیتا ہے حتیٰ کہ وہ اس کی قبر کے پاس سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ یہ روایت ابو شیخ اور دیلمی نے نقل کی ہے۔

(۱۰) ابو ہریرہ نے رسول اکرمؐ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: کوئی شخص اپنے کسی شناسا اور دوست کی قبر کے پاس سے نہیں گزرتا اور اسے سلام نہیں کہتا مگر یہ کہ اس قبر میں مدفون شخص اسے پہچانتا ہے اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔

یہ روایت تمام، خطیب، ابن عساکر اور ابن نجار نے بھی نقل کی ہے اور کنز العمال میں یہ روایت نقل کرنے کے بعد کہا گیا ہے کہ اس حدیث کی سند معتبر ہے۔

صاحب کنز العمال نے قبروں کی زیارت اور انہیں بوسہ دینے کے متعلق جو روایات نقل کی ہیں ممکن ہے کہ ان کی تعداد اسّی تک پہنچ جائے۔ جو حضرات دلچسپی رکھتے ہوں انہیں چاہیے کہ اس کتاب سے براہ راست رجوع کریں۔ کنز العمال جلد ۸۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

کرنے اور اسے خدا کے ساتھ شریک کرنے کے مترادف ہیں۔
لیکن اسے مغالطہ ہوا ہے اور وہ یہ نہیں سمجھ پایا کہ جو لوگ یہ اعمال

(پچھلے صفحہ سے آگے) صفحہ ۹۹ اور دوسرے صفحات)

(۱۱) ابوہریرہ نے رسول اکرمؐ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: کوئی شخص مجھے سلام نہیں کہتا مگر یہ کہ خدا اس کا سلام میری روح کو پہنچاتا ہے اور میں بھی اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔ (سنن بیہقی۔ جلد ۸۔ صفحہ ۲۴۵)

(۱۲) ابن عمر نے حجرِ اسود کو چھونے اور بوسہ دینے کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے جب یہ کہا کہ رسول اکرمؐ حجرِ اسود کو چومتے تھے اور اس پر اپنا ہاتھ پھیرتے تھے تو کسی نے ان کا کلام قطع کیا اور کہا: کیا اس بات کا احتمال نہیں کہ لوگوں کی بھیڑ کی وجہ سے ہم مشکل میں پڑ جائیں اور روندے جائیں اور بے بس ہو جائیں۔ ابن عمر نے کہا: ان احتمالات کو چھوڑو کیونکہ میں نے خود دیکھا ہے کہ رسول اکرمؐ حجرِ اسود کو دونوں ہاتھوں سے چھوتے اور چومتے تھے۔ یہ روایت بخاری نے بھی اپنی صحیح میں مسنّد سے نقل کی ہے۔

(۱۳) ابن عباس کہتے ہیں: میں نے خود دیکھا ہے کہ عمر حجرِ اسود کو چومتے اور اس پر پیشانی رکھتے تھے اور میں نے رسول اکرمؐ کو بھی یہی عمل انجام دیتے دیکھا ہے۔
یہ روایت طیالسی وغیرہ نے نقل کی ہے۔

(۱۴) ابوجعفر نے کہا ہے: ابن عباس نے خانۂ خدا کا ستون چوما اور اس پر اپنی پیشانی رکھی۔ انہوں نے پھر اسے چوما اور اس پر پیشانی رکھی اور یہ عمل تین مرتبہ دہرایا۔

(۱۵) عکرمہ نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے رسول اکرمؐ کو اپنا چہرہ اور پیشانی حجرِ اسود پر رکھتے ہوئے دیکھا ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

انجام دیتے ہیں وہ خدا کی توحید پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے علاوہ کسی دوسرے کو رازق نہیں سمجھتے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ پیدا کرنا اور وجود میں لانا فقط اسی کا کام

(پچھلے صفحہ سے آگے) سنن بیہقی۔ جلد ۵۔ صفحہ ۴۷۔

(۱۶) داؤد بن صالح کہتا ہے: ایک دن مروان نے ایک شخص کو دیکھا جس نے اپنا چہرہ رسول اکرمؐ کی قبر پر رکھا ہوا تھا۔ مروان نے اسے گدی سے پکڑا اور خوب مروڑا اور کہا: جانتے ہو کہ تم کیا کر رہے ہو؟ اس شخص نے جواب دیا: ہاں میں جانتا ہوں کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ مروان نے غور سے دیکھا تو اسے پتا چلا کہ وہ ابوایوب انصاری ہیں۔ ابوایوب نے اس سے کہا: میں ایک دفعہ رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سنا کہ آپ فرما رہے تھے: اگر دین کی باگ ڈور نیک اور شائستہ لوگوں کے ہاتھوں میں ہو تو اس کے لیے گریہ و زاری نہ کرو۔ دین کے لیے اس وقت آنسو بہاؤ جب دینی امور کا انتظام رذیل لوگ کر رہے ہوں۔ یہ روایت حاکم نے مستدرک (جلد ۴۔ صفحہ ۵۱۵) میں نقل کی ہے اور ذہبی نے بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ابن تیمیہ نے حجرِ اسود کو چھونے، چومنے اور اس پر چہرہ رکھنے کے بارے میں روایات اپنی کتاب "المنتقیٰ" میں نقل کی ہیں۔ (جلد ۲۔ صفحات ۲۶۱ تا ۲۶۳)

(۱۷) ابن عساکر نے نقل کیا ہے کہ فاطمہ زہرا علیہا السلام اپنے والد بزرگوار رسول اکرمؐ کی قبر پر آئیں اور اس کے سامنے ٹھہریں اور مٹی کی ایک مٹھی اٹھا کر آنکھوں پر لگائی اور گریہ فرمایا۔

(۱۸) ابن عساکر نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ: ایک بادیہ نشین عرب رسول اکرمؐ کی قبر کے پاس آیا۔ اس نے قبر کی مٹی اٹھا کر اپنے سر پر ڈالی اور آنحضرتؐ کو مخاطب کر کے کہا: یا رسول اللہ! ہم آپ کے لائے ہوئے قرآن میں پڑھتے ہیں کہ: (باقی اگلے صفحہ پر)

ہے اور یہ اعمال انجام دینے سے ان کا مقصد مذہبی شعائر کی تعظیم کے علاوہ کچھ نہیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے کہ مذہبی شعائر کی تعظیم درحقیقت خود خدا کی تعظیم ہے، اور خود اس کے سامنے فروتنی اور عاجزی کا اظہار ہے۔ یہ تعظیم خدا کے فرمان کی اطاعت اس کی بارگاہ میں تقرب اور اس کی ذات اقدس سے خلوص کے سوا کچھ نہیں اور ان اعمال میں شرک کی کوئی علامت نہیں ہے جیسا کہ پہلے وضاحت کی جا چکی ہے، شرک کا مطلب یہ ہے کہ انسان خدا کے علاوہ کسی اور کی پرستش کرے اور پرستش کے معنی بھی یہ ہیں کہ ایک شخص کسی چیز کو ستائش کے لائق سمجھتے ہوئے اس کی عبادت اور ستائش کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ فعل اور رسول اکرمؐ اور ان کے جانشینوں کی تعظیم دو بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ اس تعظیم کا محرک یہ ہے کہ آنحضرتؐ خدا کے پیغمبر ہیں اور دوسرے بزرگوار ان کے اوصیا اور جانشین ہیں اور یہ سب خدا کے عزیز اور جلیل القدر بندے ہیں۔ انہوں نے یہ عزت اور شرافت بھی اپنے نیک اعمال اور

(پچھلے صفحہ سے آگے) "جب کبھی وہ اپنے آپ پر ظلم روا رکھیں تو تمہاری پناہ ڈھونڈیں"۔ اب میں نے اپنے آپ پر ظلم روا رکھا ہے اور آپ سے پناہ مانگی ہے۔ آپ میرے بارے میں استغفار کریں اور میرے لیے مغفرت طلب کریں۔ اس پر قبر میں سے یہ آواز آتی ہوئی سنی گئی: "اے شخص تو بخشا گیا"۔

ابن عساکر کہتا ہے کہ یہ واقعہ امام علی علیہ السلام کے سامنے پیش آیا۔

(۱۹) ابن عساکر نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ بلالؓ رسول اکرمؐ کی قبر کے پاس آئے اور قبر کے سامنے روئے اور اپنا چہرہ قبر پر ملا۔ اس وقت حسنؑ اور حسینؑ وہاں آگئے۔ بلالؓ نے محبت سے انہیں سینے سے چمٹا لیا اور ان کا سر اور منہ چوما۔

خدا کی اطاعت کی بدولت ہی حاصل کی ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی مسلمان خود رسول اکرمؐ کی عبادت اور پرستش نہیں کرتا لہٰذا ان کی قبر کو پوجنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قبروں کی زیارت کرنا اور انہیں چومنا نیز قبروں اور ضریحوں کی جو تعظیم اور عزت کی جاتی ہے اسے کسی طرح بھی شرک قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر اس قسم کی عزت اور تعظیم کو شرک تصور کیا جائے تو زندہ افراد کی تعظیم کرنے کو بھی شرک سمجھنا چاہیے کیونکہ شرک ہونے کے لحاظ سے زندہ اور مردہ میں کوئی فرق نہیں جبکہ ابن تیمیہ اور اس کے پیرو یہ نہیں کر سکتے کہ ایک زندہ شخص کی تعظیم کو بھی شرک قرار دیں۔

علاوہ ازیں اگر اس قسم کے اعمال شرک گردانے جائیں تو نعوذ باللہ رسول اکرمؐ کو بھی مشرک کہنا ہوگا کیونکہ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے آنحضرتؐ ایسے اعمال انجام دیتے رہے ہیں۔ جو شخص ان اعمال کو شرک اور ان کا ارتکاب کرنے والے کو مشرک کہتا ہے کیا وہ رسول اکرمؐ سے بھی شرک منسوب کر سکتا ہے؟ حاشا و کلا! کیونکہ نبوت کے مقام سے شرک کی کوئی نسبت نہیں۔

لہٰذا یہ کہنا چاہیے کہ: یا تو بعض شرک ایسے ہیں جن میں کوئی عیب اور خرابی نہیں اور یا یہ کہ قبروں کی زیارت، تعظیم اور ان چیزوں کی عزت کرنا جو شعائر اللہ ہیں اور خدا سے منسوب ہیں، اگر پرستش کی نیت نہ ہو تو شرک کے دائرے سے باہر ہے اور ایسے اعمال کو قطعاً شرک کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ چونکہ پہلا احتمال یعنی شرک کی کچھ شکلوں کو جائز قرار دینا یقینی طور پر باطل اور بے بنیاد ہے لہٰذا ضروری ہے کہ دوسرا احتمال قبول کیا جائے اور وہ یہ کہ قبروں کی زیارت اور مدفون لوگوں کی تعظیم شرک نہیں

ہے اور اس قسم کے اعمال جو خدا کے اذن سے انجام دیے جاتے ہیں، وہ درحقیقت خدا کی عبادت اور اس کے احکام کی اطاعت ہیں۔ مذہبی شعائر کی تعظیم اور احترام تقویٰ اور روحانیت کی علامتیں اور نشانیاں ہیں جیسا کہ خدا فرماتا ہے:

"اگر کوئی شخص شعائر اللہ کی تعظیم کرے تو یہ خود تقویٰ کی نشانی ہے۔[1]"

رسول اکرمؐ کے روضہ مبارک اور خدا کے نیک اور صالح بندوں کی قبروں کی زیارت جائز ہونے کے بارے میں بہت سی روایات نقل کی گئی ہیں جن کے کچھ نمونے ہم پیش کر چکے ہیں۔

خدا کے علاوہ کسی اور کو سجدہ کرنا

جو کچھ ہم نے اب تک کہا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ خدا کے علاوہ کسی اور کے سامنے ہر قسم کی عاجزی اور فروتنی کا اظہار جس سے خدا نے منع کیا ہو، بلاشبہ حرام اور ممنوع ہے خواہ یہ فروتنی پرستش کی حد تک نہ بھی پہنچے۔

اس قسم کی فروتنی میں سے جو شرعاً ممنوع اور حرام ہے خدائے واحد کے علاوہ کسی دوسرے کو سجدہ کرنا ہے جس کے بارے میں تمام مسلمان

---

[1] سورۂ حج - آیت ۳۲

متفق ہیں اور خدا بھی اس کے متعلق یوں ارشاد فرماتا ہے:

"سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو۔ اگر تم واقعی خدا کی پرستش کرتے ہو جس نے انہیں پیدا کیا ہے تو اسی کو سجدہ کرو[1]"

اس آیت سے پتا چلتا ہے کہ سجدہ خدا کے لیے مخصوص ہے اور کسی بھی مخلوق کے لیے جائز اور روا نہیں ہے۔

پھر فرماتا ہے:

"بلاشبہ (مساجد) تو خدا ہی کے لیے مخصوص ہیں۔ پس تم خدا کے سوا کسی دوسرے کو نہ پکارو[2]"

بلاشبہ یہ آیت اسی وقت ہمارے مقصود پر دلالت کر سکتی ہے جب "مساجد" سے مراد وہ سات اعضاء ہوں جنہیں سجدہ کرتے وقت انسان زمین پر ٹکا دیتا ہے اور جیسا کہ اس آیت کے ظاہر سے پتا چلتا ہے اور ایک روایت بھی اسی معنی پر دلالت کرتی ہے[3]۔

افترا اور تہمت

شیعوں سے جو یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ وہ اپنے اماموں اور پیشواؤں کو سجدہ کرتے ہیں یہ ایک بہت بڑا بہتان اور ایک بے بنیاد اور ناقابلِ معافی افترا ہے۔ خدا جلد ہی انہیں ان لوگوں کے ساتھ اپنی عدالت میں جمع کرے گا جنھوں نے ان پر یہ افترا باندھا ہے اور وہی احکم الحاکمین

---

[1] سورہ حٰم سجدہ۔ آیت ۳۷ [2] سورۂ جن۔ آیت ۱۸

[3] وسائل الشیعہ۔ جلد ۲۔ صفحہ ۴۴۸

اور انصاف کرنے والا قاضی ہے۔

بلاشبہ ان میں سے بعض افترا باندھنے اور ناروا باتیں کہنے میں افراط کی حد تک پہنچ گئے ہیں اور انہوں نے شیعوں پر اس سے بھی بڑی اور زیادہ سخت تہمتیں باندھی ہیں حتیٰ کہ انہوں نے کہا ہے کہ شیعہ اپنے اماموں اور پیشواؤں کی قبروں کی مٹی اٹھا لیتے ہیں اور اس مٹی کو سجدہ کرتے ہیں۔ اے پروردگار! تو گواہ ہے کہ یہ بہت بڑی اور ناروا تہمت ہے[1]

---

[1] جس افترا اور تہمت کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اسی جیسی ایک اور تہمت ہے جو آلوسی نے شیعوں پر لگائی ہے۔ وہ آیہ "کلوا واشربوا حتّٰی تیبین لکم الخیط الابیض..." کی تفسیر میں کہتا ہے: شیعہ اپنا روزہ طلوع آفتاب سے شروع کرتے ہیں اور طلوع آفتاب تک کھانا پینا جائز سمجھتے ہیں۔ "کُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ الخ"

میں نہیں جانتا کہ آلوسی نے یہ معلومات کہاں سے حاصل کی ہیں اور یہ فیصلہ دیتے وقت کس سند اور دلیل پر بھروسہ کیا ہے۔ وہ بغداد میں سکونت پذیر تھا جو عراق کا پایہ تخت ہے اور عراق ماضی میں بھی اور موجودہ زمانے میں بھی شیعوں کا مرکز رہا ہے۔ بالخصوص یہ کہ مقدس مشاہد بغداد کے نزدیک واقع ہیں اور اس کی دسترس میں تھے جہاں بہت کم غیر شیعہ آباد تھے اور وہ خود شیعوں سے معلومات حاصل کر سکتا تھا۔ علاوہ ازیں ایسا بھی نہیں ہے کہ آلوسی کو شیعوں کی معتبر کتابوں اور اصلی مدارک کا علم نہ ہو لہٰذا میں نہیں جانتا کہ اس کے باوجود اس نے اس واضح مسئلے میں کیونکر اتنی بڑی غلطی کھائی ہے اور ایک بیجا اور بے بنیاد فیصلے کے اظہار کے لیے زبان کھولی ہے۔ اس نے شیعوں پر ایک ایسی تہمت لگائی ہے جو ان میں سے کسی کے عمل سے مطابقت نہیں رکھتی اور ان کی کتابوں اور مدارک میں اس کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

اس وقت شیعوں کی قدیم اور جدید کتابیں قلمی اور مطبوعہ نسخوں کی شکل میں سب لوگوں کی دسترس میں ہیں اور دنیا کے بیشتر حصوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان تمام کتابوں کے مطابق خدا کے علاوہ کسی اور کو سجدہ کرنا حرام اور ممنوع ہے۔

پس جو لوگ مٹی کو سجدہ کرنا شیعوں سے منسوب کرتے ہیں وہ یا تو مفتری ہیں جنہوں نے جان بوجھ کر ان پر افترا باندھا ہے یا وہ جاہل اور بے علم لوگ ہیں جنہیں شیعوں کی کتابوں کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے یا وہ کسی چیز پر سجدہ کرنے اور کسی چیز کو سجدہ کرنے میں کوئی امتیاز نہیں کر سکے۔

شیعہ ضروری سمجھتے ہیں کہ نماز میں سجدے کے لیے اپنی پیشانی زمین کے اصلی اجزا پر رکھی جائے اور سجدہ پتھر، ڈھیلے، ریت اور مٹی پر یا کھانے پینے کی چیزوں کو چھوڑ کر ایسی چیزوں پر کیا جائے جو زمین سے اُگتی ہیں۔

علاوہ ازیں شیعوں کے عقیدے کے مطابق زمین کے دوسرے اجزا کے مقابلے میں مٹی پر سجدہ کرنا بہتر ہے اور مٹی میں بھی سید الشہداء حضرت امام حسینؑ کے روضۂ مبارک کی مٹی پر سجدہ کرنا زیادہ ثواب کا موجب ہے کیونکہ یہ خدا کی راہ میں بے نظیر جانبازی اور قربانی کی یاد دلاتی ہے۔

(پچھلے صفحہ سے آگے) اس میں شک نہیں کہ یہی ناروا تہمتیں اور بیجا فیصلے ہیں جنہوں نے مسلمانوں کے درمیان اختلاف اور انتشار پیدا کر دیا ہے اور دشمنوں کو ان پر مسلط اور غالب کر دیا ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ کوئی خفیہ ہاتھ پسِ پردہ مصروفِ عمل ہو جو یوں بھائیوں کی زبانیں کھلوا رہا ہو اور اس ذریعے سے ان کے درمیان دشمنی اور عداوت کا بیج بو رہا ہو۔

سجدے کے بارے میں یہ شیعوں کے عقیدے کا خلاصہ ہے جو انہوں نے ائمہ اہل بیت علیہم السلام اور خاندانِ وحی سے حاصل کیا ہے[1]

اس صورت میں شرک کو شیعوں سے کیسے منسوب کیا جا سکتا ہے اور یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ خدا کے علاوہ کسی اور کو سجدہ کرتے ہیں[2]؟ کیا یہ باتیں ناروا نہیں ہیں اور افتراء کا درجہ نہیں رکھتیں اور کیا یہ افتراء قابلِ معافی ہے؟

---

[1] وسائل۔ جلد ا۔ صفحات ۳۲۳ تا ۳۲۶۔

[2] اس سلسلے میں عالی قدر مؤلف نے حجاز کے ایک عالم سے جو گفتگو کی ہے اُسے وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

سنہ ۱۳۵۳ ہجری قمری میں جب میں حج بیت اللہ سے مشرف ہو کر مدینہ گیا تو وہاں مسجد نبوی میں ایک فاضل اور صاحبِ علم پیرمرد کو دیکھا جس کا نام زین العابدین تھا۔ وہ ان لوگوں پر نظر رکھے ہوئے تھا جو سجدہ گاہ پر سجدہ کرتے تھے اور وہ جس کے ہاتھ میں سجدہ گاہ دیکھتا اس سے لے لیتا تھا۔ میں نے اس سے کہا:

اے شیخ! کیا رسولؐ خدا کے حرم میں مسلمانوں کے مال پر ان کی اجازت اور رضامندی کے بغیر قبضہ کرنا جائز اور روا ہے؟

اس نے جواب دیا: نہیں۔

میں نے کہا: تم جو مسلمانوں کا مال چھین رہے ہو، اس کا کیا جواز ہے جبکہ وہ شہادت دیتے ہیں کہ اللہ ایک ہے اور محمدؐ اس کے بندے اور رسولؐ ہیں۔

اس نے مجھے جواب دیا: وہ مسلمان نہیں ہیں مشرک ہیں کیونکہ یہ لوگ سجدہ گاہ کو بھی اپنے لیے بت بنا لیتے ہیں اور اسے سجدہ کرتے ہیں۔

میں نے کہا: کیا آپ اس بات پر تیار ہیں کہ ہم دونوں اس بارے (باقی اگلے صفحہ پر)

(پچھلے صفحہ سے آگے) میں مفصل گفتگو اور بحث کریں۔

اس نے کہا: اس سے بہتر اور کیا بات ہوسکتی ہے۔

چنانچہ بحث شروع ہوگئی اور اس کے نتیجے میں اس نے اپنے قول اور فعل کے لیے مجھ سے معذرت کرلی اور اپنے پروردگار کی بارگاہ میں استغفار کی اور مغفرت طلب کی۔ اس نے کہا: میں کینہ ور اور متعصب شخص نہیں ہوں۔ آج تک میں غلطی پر تھا اور اس معاملے کی حقیقت میری نگاہوں سے اوجھل تھی۔ پھر اس نے مجھ سے درخواست کی کہ اس بحث اور مذاکرے کو دوسرے موضوعات کے بارے میں جاری رکھا جائے تاکہ کچھ پوشیدہ حقائق واضح ہوجائیں۔ چنانچہ مفصل بحث اور مذاکرے کی مجلس راتوں کو مسجد نبوی میں منعقد ہوتی تھی اور مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگ اس میں شرکت کرتے تھے۔ میرے وہاں دس دن قیام کے دوران یہ مجالس جاری رہیں۔ ان مذاکرات کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عالم شخص شیعوں کے بارے میں اپنے نظریات سے دستبردار ہوگیا۔ ان کا اور ان کے عقائد کا احترام کرنے لگا اور ان کے خیالات اور نظریات کی قدر کرنے لگا۔

اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ ان مذاکرات کا نتیجہ مجلہ "ام القریٰ" میں شائع کرے گا تاکہ جو لوگ حق کے طلب گار ہیں، اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں، کینے اور ضد سے دور ہیں لیکن غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ ان پر حقیقت واضح ہوجائے۔ اس نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ اس مجلے کا ایک نسخہ مجھے بھیجے گا۔ تاہم اس نے اپنے وعدے پر عمل نہیں کیا۔ ممکن ہے صورتحال اس کی متقاضی نہ رہی ہو یا کچھ ایسی رکاوٹیں پیش آئی ہوں جن کی بنا پر وہ اپنا وعدہ پورا نہ کرسکا ہو۔

خدا کی اسی وسیع زمین کا ایک حصہ ہے جسے اس نے اپنے پیغمبرؐ کے لیے پاک، پاک کرنے والی اور سجدے کی جگہ قرار دیا ہے۔[1]

تاہم کیا شان ہے اس پاک اور مقدس مٹی کی جس نے جگر گوشۂ رسول اور چمنستان رسالت کے پھول کو اپنی آغوش میں لے رکھا ہے۔ یہاں بہشت کے جوانوں کے سردار آرام فرما رہے ہیں۔ اس مٹی کے پہلو میں اس عظیم انسان کا جسدِ مبارک محوِ خواب ہے جس نے اپنے نانا رسول اکرمؐ کے مقصد کو زندہ کرنے، انسانوں کو آزادی دلانے اور ظلم و ستم کو مٹانے کے لیے خود اپنے آپ کو، اپنے فرزندوں، عزیزوں اور وفادار ساتھیوں کو خدا کی راہ میں قربان کر دیا۔ یہ مٹی انسانوں کو خدا کی راہ میں جانبازی اور فداکاری کا سبق سکھاتی ہے، انہیں شرافت اور عظمت کا درس دیتی ہے اور ان کے ذہنوں میں ایک بے نظیر تاریخی واقعے کی یاد زندہ کرتی ہے۔ ان دلائل کی بنا پر اس مٹی کو قدرتی طور پر ایک خاص اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔

شیعہ جو اس مٹی کی فضیلت کے قائل ہیں اس کی پرستش نہیں کرتے بلکہ درحقیقت وہ خدا کی راہ میں جانبازی و فداکاری، روحانیت و انسانیت، آزادی و حریت اور ظلم و ستم کے خلاف جنگ، نیز نیکی اور نیک لوگوں کی قدر کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں شیعہ اور سنی دونوں ذرائع سے کربلا کی مٹی کی فضیلت کے بارے میں رسول اکرمؐ سے روایات نقل کی گئی ہیں۔[2]

---

[1] سنن بیہقی۔ جلد ۱۔ صفحات ۲۱۲ - ۲۱۳

[2] وسائل الشیعہ۔ جلد ۱۔ صفحہ ۳۲۶۔

ابو یعلیٰ نے اپنی مسند میں اور ابن ابی شیبہ اور سعید نے منصور سے (باقی اگلے صفحہ پر)

اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ اس بارے میں رسول اکرمؐ سے کوئی روایت صادر نہیں ہوئی، تب بھی، کیا عقل کی رو سے یہ جائز بلکہ بہتر نہیں ہے کہ ہر مسلمان

(پچھلے صفحہ سے آگے) اپنی سنن میں امام علی علیہ السلام کی سند سے یوں نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا:

ایک دن میں رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دیکھا کہ آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ میں نے کہا: یا رسولؐ اللہ! کسی نے آپ کو تکلیف دی ہے یا ناراض کیا ہے؟ آپ کی آنکھوں سے آنسو کیوں جاری ہیں؟

آپ نے فرمایا: ہاں! جبرئیل میرے پاس آئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ میرا حسینؑ دریائے فرات کے کنارے قتل کردیا جائے گا۔ کیا تم حسینؑ کی قبر کی مٹی سونگھنا چاہتے ہو؟

میں نے کہا: ہاں یا رسولؐ اللہ! آپ نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور مٹھی بھر مٹی جو آپ کے پاس تھی مجھے دی۔ میں نے جب اس مٹی کو دیکھا تو بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

طبرانی نے تاریخ کبیر میں ام سلمہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: ایک رات رسول اکرمؐ عبادت میں مصروف تھے۔ میں اچانک نیند سے بیدار ہوئی تو میں نے دیکھا کہ وہ بہت غمگین ہیں اور ان کے ہاتھ میں قرمزی رنگ کی مٹی ہے جسے وہ دیکھ رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! آپ کے ہاتھ میں یہ کیسی مٹی ہے؟

آنحضرتؐ نے فرمایا: جبرئیلؑ نے مجھے خبر دی ہے کہ میرا حسینؑ عراق کی سرزمین پر قتل کیا جائے گا۔ میں نے اس سے کہا کہ جس زمین پر میرا حسینؑ قتل ہوگا وہ مجھے اس مٹی کا نمونہ لادیں۔ چنانچہ یہ وہی مٹی ہے جو تم میرے ہاتھ میں دیکھ رہی ہو۔

یہ روایت مختصر سے لفظی تفاوت کے ساتھ ابن ابی شیبہ نے بھی ام سلمہ سے نقل کی ہے اور ابن ماجہ، طیالسی اور ابونعیم نے بھی اسی مضمون کی روایت ام سلمہ سے نقل کی ہے اور ابونعیم نے ایسی ہی حدیث انس سے نقل کی ہے۔ (کنز العمال۔ جلد ۷، صفحات ۱۰۵-۱۰۶)۔

اس مٹی کی ایک مٹھی بھر مقدار اپنے پاس رکھے اور عام مٹی کی بجائے اپنی پیشانی اس مٹی پر رکھے؟ کیونکہ علاوہ ازیں کہ یہ مٹی زمین کا جزو ہے اور شرعاً اس پر سجدہ کرنا صحیح ہے، اس میں ایک بہت بڑی رمز پوشیدہ ہے اور ایک باریک اور اہم نکتے کی جانب اشارہ موجود ہے کہ جو شخص اس مٹی پر سجدہ کرے اور اپنے آپ کو اس مٹی کے مالک (سید الشہداء ع) کا سچا اور مخلص پیرو سمجھتا ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ شجاع، غیور اور فداکار ہو نہ کہ بزدل اور کاہل۔ اسے چاہیے کہ مسلمانوں کے حالات کی اصلاح اور دین کی سربلندی کی خاطر رضاکارانہ طور پر مال و دولت اور رتبہ و منصب غرضیکہ ہر چیز سے بے نیاز ہو جائے اور وہ جو کچھ بھی رکھتا ہو اسے اس عظیم اور مقدس مقصد کی خاطر ٹھکرا دے۔

کیا یہ افسوس کا مقام نہیں ہے کہ ایک ایسا عمل جو انسان کو اتنا عظیم درس دیتا ہو اور اس کی تربیت اور اس کی شخصیت کی تعمیر پر اتنا گہرا اثر ڈالتا ہو اسے شرک قرار دیا جائے؟ یہ کتنے تعجب کی بات ہے!

آدم ع کو سجدہ کرنے کے بارے میں مختلف نظریات

اب ایک نکتے پر بحث باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ جب خدا کے علاوہ کسی دوسرے کو سجدہ کرنا جائز نہیں ہے تو فرشتوں نے آدم ع کو جو سجدہ کیا اس کی کیا نوعیت تھی اور وہ کیونکر جائز ہو گیا؟

علم تفسیر اور علم کلام کے علماء نے اس سوال کے مختلف جواب دیے ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:

(۱) کہا جاتا ہے کہ فرشتوں کا آدمؑ کو سجدہ کرنا اس کے معروف اور عام معنوں میں نہیں بلکہ فروتنی اور انکساری کے اظہار کے طور پر تھا۔

جواب

ہمارے نزدیک یہ نظریہ درست نہیں ہے کیونکہ "خضوع" یعنی فروتنی لفظ سجدہ کے ظاہری معنوں کے برخلاف ہے اور بغیر کسی شہادت اور مماثلت کے یہ معنی قبول نہیں کیے جا سکتے۔ علاوہ ازیں بہت سی روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جب فرزندانِ آدمؑ اپنے پروردگار کو سجدہ کرتے ہیں تو شیطان کو بے حد رنج ہوتا ہے اور وہ نالہ و فریاد کرنے لگتا ہے۔ ان روایات سے پتا چلتا ہے کہ جس سجدے کا خدا نے فرشتوں کو حکم دیا اور شیطان نے اس حکم سے سرتابی کی وہ سجدے کی اسی معروف اور عام صورت میں تھا جو بندے خدا کے لیے انجام دیتے ہیں اور جسے دیکھ کر شیطان رنجیدہ ہوتا ہے کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ بنی آدمؑ ایک عمل انجام دیکر خدا کے حکم کی اطاعت کرتے ہیں اور اسکی بارگاہ میں تقرب چاہتے ہیں جبکہ اسی عمل سے انکار کر کے وہ راندۂ درگاہ ہوگیا تھا۔

(۲) کہا جاتا ہے کہ فرشتوں نے خدا کو ہی سجدہ کیا، تاہم انہیں حکم ملا تھا کہ اس سجدے میں آدمؑ کو اپنا قبلہ قرار دیں اور ان کی طرف منہ کر کے سجدہ کریں، جیسے کہ قبلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی جاتی ہے چنانچہ خدا نے آدمؑ کی عزت اور تعظیم کی خاطر فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کی طرف رخ کر کے مجھے سجدہ کرو۔

جواب

ہمارے نظریے کے مطابق یہ تصور بھی غلط ہے کیونکہ یہ تاویل اور توجیہہ ان آیات اور روایات کے ظاہری معنوں کے برخلاف ہے جو آدمؑ کو سجدہ کرنے کے موضوع پر وارد ہوئی ہیں بلکہ یہ تاویل آیتِ قرآنی کے صریح الفاظ کے بھی خلاف ہے کیونکہ شیطان نے اس بنا پر سجدہ کرنے سے انکار کردیا تھا کہ وہ اس سے بلند و برتر رتبے کا مالک ہے، لہٰذا اگر اس سجدے کا مقصد خدا ہی کو سجدہ کرنا ہوتا اور آدمؑ کی حیثیت فقط قبلہ کی ہوتی تو اس صورت میں شیطان کا یہ کہنا بے معنی ہوتا کہ "کیا میں اسے سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے"، کیونکہ اکثر یہ ممکن ہوتا ہے کہ سجدہ کرنے والا اس چیز سے زیادہ رتبے کا مالک ہو جسے اس نے خدا کی عبادت کرتے وقت اپنا قبلہ قرار دیا ہو۔

(۳) کچھ لوگ کہتے ہیں کہ چونکہ آدمؑ کو خدا کے حکم سے سجدہ کیا جانا تھا اس لیے اس کا انجام دینا خدا ہی کے لیے اور اسی کے حکم کی تعمیل کی خاطر تھا۔ اس لیے وہ سجدہ درحقیقت خدا کی مقدس ذات کو سجدے کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہوسکتی۔

اس کی توضیح یوں کی جاسکتی ہے کہ سجدہ فروتنی اور عاجزی کی انتہا اور عبودیت اور بندگی کے اظہار کا آخری مرحلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے سجدے کو اپنی ذاتِ اقدس سے مخصوص کردیا ہے اور بندوں کو کسی دوسرے کے لیے سجدہ کرنے کی اجازت نہیں دی۔ خواہ یہ سجدہ عبودیت اور بندگی کی نیت سے نہ بھی کیا جائے۔

لیکن اگر خدا کے حکم سے خدا کے علاوہ کسی دوسرے کو سجدہ کیا جائے

تو ایسا سجدہ خدا کی پرستش، اطاعت اور اس کی بارگاہ میں تقرب حاصل کرنے کا ذریعہ ہو گا کیونکہ یہ اس کا حکم بجالانے کی خاطر کیا جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے حکم سے سرتابی کرنے والے افراد کو سزا دینا صحیح اور جائز ہے اور ایک سرکش شخص کا یہ بہانہ اور عذر قابلِ قبول نہیں ہے کہ یہ سجدہ مخلوق کے سامنے فروتنی اور عاجزی ہے اور خدا کے علاوہ کسی دوسرے کے سامنے فروتنی جائز نہیں ہے۔[1]

---

[1] مندرجہ ذیل سطور میں آیۂ سجدہ کی تاویل کے سلسلے میں اہل کشف کے خیالات پیش کیے جاتے ہیں جو اپنے آپ کو امورِ غیب ظاہر کرنے کا اہل سمجھتے ہیں۔

حسن بن منصور کہتا ہے کہ جب ابلیس کو حکم دیا گیا کہ وہ آدم کو سجدہ کرے تو اس نے عرض کیا: اے پروردگار! تو سجدے میں سے اس قدر و قیمت اور اہمیت کو ہٹائے جو میں اسکے لیے اپنے دل میں محسوس کرتا ہوں تاکہ تیرے سوا کسی کو سجدہ کرنا اس کی بزرگی اور برتری کی نشانی نہ ٹھہرے۔ اس صورت میں میں آدم کو سجدہ کروں گا اور اب جو تو مجھے آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دے رہا ہے تو دوسری جانب تو نے ہی مجھے تیرے سوا دوسرے کو سجدہ کرنے سے بھی منع کیا ہے۔

خدا نے فرمایا: اگر تو آدم کو سجدہ نہیں کرے گا تو میں تجھے دائمی عذاب میں مبتلا کروں گا۔

ابلیس نے کہا: اے پروردگار! کیا تو مجھے عذاب اور عقوبت میں مبتلا کیجئے گا؟

خدا نے فرمایا: ہاں!

ابلیس نے کہا: خداوندا! تو مجھے اس عذاب میں مبتلا دیکھے گا اور میرے حال پر نظر ڈالے گا، تو بس یہی چیز اس عذاب کو میرے لیے شیریں اور خوشگوار بنا دیتی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ہمیشہ تیرے عذاب میں گرفتار رہوں۔ پس تو میرے بارے میں جو کچھ کرنا چاہے کرلے۔

(تفسیر ابن روزبہان صفحہ ۲۱ مطبوعہ ہندوستان) (باقی اگلے صفحہ پر)

ہمارے خیال میں یہ بہترین اور درست نظریہ ہے کیونکہ بندے کو چاہیئے کہ اپنے آقا کا فرمانبردار رہے، اس کے حکم اور مرضی کے مطابق عمل کرے اور کسی معاملے میں اپنے آپ کو آزاد نہ سمجھے اور اس کی حکم عدولی نہ کرے چنانچہ جب آقا کی طرف سے مثلاً یہ حکم ملے کہ "فلاں شخص کے سامنے فروتنی اور عاجزی کا اظہار کرو تو اسے چاہیے کہ اس حکم کی تعمیل کرے اور اس شخص کے سامنے فروتنی اور خاکساری کا اظہار کرے لیکن یہ فروتنی اور یہ عاجزی اور خاکساری کا اظہار درحقیقت خود آقا کے لیے ہوتا ہے کیونکہ یہ فعل اس کے حکم کے مطابق اور اس کی بزرگی اور آقائی کی خاطر انجام دیا جاتا ہے[1]۔

(پچھلے صفحہ سے آگے) مؤلف: مکاشفہ کے حامیوں کو خوش ہونا چاہیے کہ ابن روزبہان اور اس کے ہم خیال لوگوں نے ایسے مکاشفوں تک دسترس حاصل کر لی ہے جو نہ عقل اور منطق کے مطابق ہیں اور نہ قرآن کی صراحت اور دین کی بداہت سے مطابقت رکھتے ہیں۔

[1] امام جعفر صادقؑ سے نقل کیا گیا ہے: ابلیس نے خدا سے عرض کیا کہ اے پروردگار! تو مجھے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے معاف رکھ، پھر میں تیری ایسی عبادت کروں گا کہ مقرب فرشتوں اور نبیوں میں سے کسی نے نہ کی ہوگی۔

خدا نے فرمایا: مجھے تیری عبادت کی حاجت نہیں اور میری عبادت میرے حکم اور ارادے کے مطابق ہونی چاہیے نہ کہ جیسے تم چاہتے ہو (تفسیر صافی صفحہ ۲۶ ذیل آیہ فَسَجَدُوٓا اِلَّآ اِبۡلِیۡسَ)

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک زندیق نے امام صادقؑ سے پوچھا: خدا نے یہ حکم فرشتوں کو کیونکر دیا کہ آدمؑ کو سجدہ کریں؟ امامؑ نے فرمایا: ہر کوئی خدا کے حکم کی تعمیل میں سجدہ کرتا ہے۔ پس فرشتوں کا آدمؑ کو سجدہ کرنا جو خدا کے حکم کے مطابق تھا خدا کو سجدہ کرنا ہے۔ (بحار الانوار۔ فصل سجود ملائک۔ جلد ۵، صفحہ ۳۷)۔

نتیجہ

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ جو عمل خدا کی بارگاہ میں تقرب کے لیے انجام دیا جائے اسے انجام دینے کے لیے ضروری ہے کہ خدا کی طرف سے کوئی خاص یا عام حکم صادر ہوا ہو اور اگر کسی موضوع پر حکم صادر ہونے کے بارے میں شک ہو تو "چار شرعی دلائل" کے مطابق ایسے عمل کے ساتھ خدا سے تقرب چاہنا اور اس کی عبادت کرنا دین میں بدعت تصور کی جائے گی جو حرام ہے۔

تاہم قبروں کی زیارت کرنا، انہیں بوسہ دینا اور با فضیلت اور مقدس لوگوں کے احترام کے طور پر ان کی تعظیم کرنا ایسی چیزیں ہیں جن کا جائز ہونا عقلی دلائل اور بہت سی روایات سے بھی ثابت اور تسلیم ہو چکا ہے بالخصوص وہ روایات جو ائمہ اہلبیت علیہم السلام سے ہم تک پہنچی ہیں اس معاملے کو زیادہ واضح اور قابل قبول بناتی ہیں کیونکہ رسول اکرمؐ نے انہیں قرآن مجید کا ہم پلہ قرار دیا ہے اور ان کے اقوال کو قرآن کی طرح حجت اور مدرک بتایا ہے چنانچہ آپؐ کا ارشاد ہے:

"میں تمہارے درمیان دو اہم یادگاریں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔
ان میں سے ایک قرآن ہے اور دوسری میری عترت میرے اہلبیتؑ ہیں۔" (حدیث ثقلین)

عام دلائل اور اہلبیت علیہم السلام کے ارشادات اور اہل سنت کی روایات سے جو پیشتر نقل کی گئی ہیں، نیز گزشتہ اور موجودہ ادوار میں مسلمانوں

کی روش اور طریقہ جس کے مطابق قبروں کی زیارت ان کا معمول رہا ہے، اس فعل کا جائز ہونا ثابت ہو چکا ہے۔

شرک کیسے ثابت ہوتا ہے؟

اگر خدا کے علاوہ کسی دوسرے کے سامنے ایک خاص قسم کی فروتنی اور عاجزی کے اظہار سے روک دیا جائے یا کوئی عبادت خواہ وہ خدا کے لیے ہی ہو ممنوع قرار دی جائے مثلاً عید الفطر اور عید الاضحیٰ کا روزہ اور عورتوں کا حیض کی حالت میں نماز پڑھنا اور محترم مہینوں کے علاوہ کسی اور مہینے میں حج کرنا، تو یہ تمام چیزیں حرام اور شرعاً ممنوع ہوتی ہیں اور ان کا ارتکاب کرنے والا سزا کا مستوجب ہوتا ہے۔ تاہم ان حرام عبادات کے انجام دینے سے کوئی انسان مشرک اور کافر نہیں ہو جاتا۔

لہٰذا ہر حرام کام کے ارتکاب سے شرک اور کفر لازم نہیں آتا، جیسا کہ پہلے وضاحت کی گئی ہے کہ شرک سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو بندہ اور کسی دوسرے انسان یا چیز کو اپنا خدا اور پروردگار سمجھتے ہوئے اس کے سامنے فروتنی اور عاجزی کا اظہار کرے اور بندگی اور عبودیت کی نیت سے اس کی تعظیم اور احترام کرے۔

پس اگر کوئی شخص بندگی کی نیت کیے بغیر خدا کے علاوہ کسی دوسرے کو سجدہ کرے تو گو یہ فعل گناہ اور حرام ہے لیکن پھر بھی یہ اس کے کفر، ارتداد اور دین سے خارج ہونے کا موجب نہیں بن سکتا کیونکہ ایک انسان کے اسلام کا دارومدار شہادتین کے اقرار پر ہے۔ شرعی نقطۂ نگاہ سے شہادتین کا یہی اقرار اس کی جان و مال کو قابلِ احترام بناتا ہے اور اسے ہر قسم کی زیادتی اور تجاوز سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہ ایک

مسلمہ اور ناقابلِ تردید حقیقت ہے جو شیعہ اور سنی دونوں ذرائع سے نقل کی گئی متواتر اور معتبر روایات سے ثابت ہوتی ہے۔[1]

---

[1] سماعہ نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ اسلام "خدائے واحد کی وحدانیت اور خاتم الانبیاء حضرت محمدؐ کی رسالت کی شہادت" سے عبارت ہے۔ ان دو شہادتوں سے لوگوں کا خون محترم اور بہائے جانے سے محفوظ ہو جاتا ہے اور ان میں نکاح اور وراثت کے رشتے قائم ہو جاتے ہیں۔ (وافی۔ جلد ۳ صفحہ ۱۸)۔

ابو ہریرہ نے رسولِ اکرمؐ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ہم ان لوگوں سے جنگ کریں گے حتیٰ کہ وہ خدائے واحد کی وحدانیت کی شہادت دیں اور جو کچھ مجھ پر نازل ہوا ہے اس پر ایمان لائیں۔ جب وہ ان دو باتوں کا اقرار کر لیں گے تو وہ امان میں ہوں گے اور بغیر حق کے کسی کے لیے ان کے جان اور مال پر تجاوز کرنا جائز نہ ہوگا اور ان کے اعمال کا حساب خدا کے پاس ہے۔

یہ حدیث جابر اور عبداللہ ابن عمر نے معمولی تفاوت کے ساتھ نقل کی ہے اور اہلِ سنت کی معتبر کتابوں میں بھی موجود ہے۔ یہ حدیث صحیح مسلم (جلد ۱۔ صفحہ ۳۹) صحیح ترمذی (جلد ۱۔ صفحہ ۶۸) اور سنن نسائی (جلد ۲ صفحات ۱۶۱ اور ۲۷۹) میں آئی ہے اور احمد نے بھی اسے اپنی مسند کی جلد ۲۔ صفحات ۳۴۵ اور ۵۲۸ پر ابو ہریرہ سے۔ جلد ۳۔ صفحات ۱۹۹ اور ۲۲۴ پر انس سے جلد ۵۔ صفحہ ۲۴۶ پر معاذ بن جبل سے اور جلد ۵ صفحہ ۴۳۳ پر عبداللہ بن عدی سے نقل کیا ہے۔ یہی روایت اس نے تیسیر الوصول کی جلد ۱۔ صفحہ ۲۰ پر عبداللہ ابن عمر اور عبیداللہ کی سند سے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: یہ روایت مسلم، بخاری اور مالک نے بھی نقل کی ہے۔

پھر ابو ہریرہ رسول اکرمؐ سے نقل کرتا ہے کہ آپ نے فرمایا: میں اس بات پر مامور ہوں کہ لوگوں سے جنگ کروں حتیٰ کہ وہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کہیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

اس صورت میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ جو لوگ شہادتین کا اقرار کرتے ہوئے بارگاہِ خداوندی میں تقرب حاصل کرنے کے لیے رسول اکرمؐ اور انکے جانشینوں کے مزارات کی زیارت کریں انہیں مشرک کہا جائے اور ان پر کفر اور زندقہ کی تہمت لگائی جائے جبکہ قرآن فرماتا ہے:

(پچھلے صفحہ سے آگے) اور جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہے اس کا مال اور اس کی جان امان میں ہوں گے بجز اس کے کہ اس پر کسی کا کوئی حق ہو اور اس کے اعمال کا حساب خدا کے پاس ہے۔

یہ روایت مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی، نسائی، احمد اور طیالسی نے نقل کی ہے اور بخاری نے اسے اپنی صحیح کی آٹھویں جلد کے صفحہ ۵۰ پر درج کیا ہے۔

اوس بن اوس ثقفی کہتا ہے: ہم مسجد مدینہ میں تھے کہ رسول اکرمؐ ہمارے پاس تشریف لائے۔ اس وقت ایک شخص آپ کے سامنے آیا اور آپ سے کچھ کہا جو ہم نے نہیں سنا۔ آنحضرتؐ نے جواب میں فرمایا: جاؤ اور کہہ دو کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ یہ حکم دینے کے بعد آپ نے دوبارہ اس شخص کو اپنے پاس بلایا اور فرمایا: شاید وہ خدا کی وحدانیت اور میری رسالت کی شہادت دیتا ہے۔ اس شخص نے جواب دیا: جی ہاں۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا: جب یہ صورت ہے تو جاؤ اور ان لوگوں کو کہہ دو کہ اسے قتل کرنے سے باز رہیں اور اسے رہا کر دیں کیونکہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں کے ساتھ جنگ کروں حتیٰ کہ وہ خدا کی وحدانیت اور میری رسالت کی گواہی دیں۔ جب وہ ان دونوں حقیقتوں کا اقرار کر لیں تو ان کا مال اور جان محترم اور محفوظ ہوں گے بجز اس کے کہ کوئی حق ان کے ذمے ہو اور ان کے اعمال کا حساب خدا کے پاس ہے۔

یہ روایت ابوداؤد، طیالسی، احمد، دارمی اور طحاوی نے نقل کی ہے۔

(کنز العمال۔ جلد ۱ صفحہ ۳۷۵)

"جو شخص تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے اس سے یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں ہو۔[1]"

انہیں تہمت اور افتراؤں میں آگے بڑھنے دو۔ جو کہتے ہیں کہنے دو۔ افترا باندھنے دو۔ تہمت لگانے دو۔ تکفیر کرنے دو کیونکہ ایک دن انصاف کرنے والا پروردگار اپنے بندوں کے درمیان عدل سے حکم جاری فرمائے گا اور وہی احکم الحاکمین اور بہترین انصاف کرنے والا ہے۔

پرستش کے محرکات

چونکہ عبادت ایک اختیاری اور ارادی عمل ہے اس لیے ضروری ہے کہ انسان کے اندر ایک مقصد اور محرک موجود ہو جو اسے عمل کے انجام دینے پر ابھارے اور عبادت اور پرستش کی ترغیب دے۔ یہ محرک مندرجہ ذیل چیزوں میں سے کوئی ایک ہو سکتا ہے:

(۱) بعض اوقات خدا کے احسان اور انعام کی امید انسان کے لیے محرک ہوتی ہے جو اسکے دل میں موجود ہوتی ہے' وہ اس اجر و ثواب کا امیدوار ہوتا ہے جو عبادتوں کے لیے مقرر کیا گیا ہے اور جس کا وعدہ کیا گیا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

"جو شخص خدا اور اس کے پیغمبرؐ کی اطاعت کرے اسے خدا جنت میں داخل کرے گا جس میں نہریں

---

[1] سورۂ نساء۔ آیت ۹۴

جاری ہوں گی[1]"

"وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے اچھے کام کیے خدا نے ان سے مغفرت اور بہت بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے[2]"

(۲) بعض اوقات انسانوں میں پرستش کا محرک سزا کا خوف ہوتا ہے اور وہ اسی خوف کے زیرِ اثر عبادت اور پرستش کرتا ہے۔ قرآنی آیات میں اس محرک کی جانب ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے:

"اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو اس بڑے سخت دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں[3]"

"ہمیں اپنے پروردگار کی طرف سے اس سخت ترین اور ہولناک دن کا ڈر ہے[4]"

بعض آیات میں ان دونوں محرکات کی جانب اشارہ کیا گیا ہے:

"وہ اپنے بستروں پر سے اٹھتے ہیں اور امید و بیم کے ساتھ اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں[5]"

"خدا کو خوف اور امید کے ساتھ پکارو یقیناً اس کی رحمت نیکی کرنے والوں کے قریب ہے[6]"

"وہ بارگاہِ خداوندی میں تقرب کے ذریعے ڈھونڈتے ہیں تاکہ پتا چل جائے کہ ان میں سے کون خدا کے زیادہ

۱۔ سورۂ نساء - آیت ۱۳
۲۔ سورۂ مائدہ - آیت ۹
۳۔ سورۂ یونس - آیت ۱۵
۴۔ سورۂ دہر - آیت ۱۰
۵۔ سورۂ سجدہ - آیت ۱۶
۶۔ سورۂ اعراف - آیت ۵۶

قریب، اس کی رحمت کا امیدوار اور اس کے عذاب سے
ڈرنے والا ہے[1]۔"

(۳) بعض اوقات انسان خدا کی عبادت اس لیے کرتا ہے کہ وہ اسے عبادت کے لائق سمجھتا ہے اور فقط یہی احساس اسے عبادت پر آمادہ کرتا ہے کیونکہ خدا اپنی ماہیت کے لحاظ سے کامل ہے اور اس میں جمال، جلال اور کمال کی تمام صفات جمع ہیں۔

یہ عبادت کا بہترین اور بلند ترین مرتبہ ہے۔ اس قسم کی عبادت وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے وجود کو حق تعالےٰ کی ذات میں فنا کر دیں اور اس کے وجودِ مطلق کے سامنے اپنے وجود کا احساس نہ کریں۔ وہ نہ تو عبادت میں اپنی کوئی ذاتی منفعت مدّنظر رکھتے ہیں اور نہ کسی سزا سے ڈرتے ہیں۔ ان کی توجہ فقط اپنے پروردگار اور پیدا کرنے والے کی طرف ہوتی ہے اور اس کے علاوہ وہ ہر جگہ اور ہر شخص سے اپنی توجہ ہٹا لیتے ہیں۔

بلاشبہ خالص عبادت فقط وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جو بندگی کے اس مرحلے پر پہنچ گئے ہوں۔ وہ اپنی عبادت میں خدا کی ذاتِ اقدس کے علاوہ کوئی محرک محسوس نہیں کرتے۔ ہمیں معصومین علیہم السلام کے علاوہ کسی ایسے شخص کا علم نہیں جو بندگی کے اس مرتبے پر پہنچا ہو اور اس نے ایسی عبادت انجام دی ہو کیونکہ وہی ہیں جو اخلاص کی منزل پر پہنچے ہیں اور ان مخلص بندوں میں شامل ہوئے ہیں جن کے نزدیک نہ شیطان پھٹک سکتا ہے اور نہ ورغلا سکتا ہے۔ وہ وہی افراد ہیں جن کے بارے میں قرآن میں آیا ہے کہ شیطان نے کہا:

---

[1] سورۂ بنی اسرائیل - آیت ۵۷

"میں یقیناً سب کو بہکاؤں گا بجز ان کے جو تیرے مخلص بندے ہیں[1]"

امیر المومنین امام علی علیہ السلام بھی اس مقام پر کہتے ہیں:

"میں تیری پرستش آتشِ جہنم کے خوف یا بہشت کی آرزو کی بنا پر نہیں کرتا، بلکہ تجھے عبادت کے لائق سمجھتا ہوں اس لیے تیری عبادت کرتا ہوں[2]"

عبادت کی یہ منزل فقط امام علی علیہ السلام اور انہیں جیسے افراد سے مخصوص ہے جو عبودیت کے کمال کو پہنچ گئے ہیں اور خدا کے علاوہ کسی شخص یا چیز کو اہمیت نہیں دیتے۔ حتیٰ کہ خود اپنے آپ سے بھی بے خبر ہیں۔ دوسرے عبادت گزاروں کی عبادت اور پرستش فقط پہلی دو قسموں تک محدود ہے کیونکہ دوسرے افراد بندگی کے اس مرتبے پر نہیں پہنچے کہ خدا کے سوا کسی کو نہ دیکھیں حتیٰ کہ پروردگار کی ذاتِ اقدس کے سامنے اپنی ہستی اور وجود کو بھی بھلادیں اور اپنے نفع اور نقصان کا کچھ خیال نہ کریں بلکہ خدا کی پرستش فقط خدا کی خاطر کریں۔

اس تمہید کے ساتھ ان لوگوں کے نظریے کا غلط اور بے بنیاد ہو جانا واضح ہو جاتا ہے جو کہتے ہیں کہ اگر خدا کی عبادت کا موجب انسان کا خوف اور امید ہو اور اس کا محرک خوف یا حرص ہو تو ایسی عبادت درست نہیں ہے بلکہ لازم ہے کہ عبادت خدا کی خاطر انجام دی جائے اور وہ بھی فقط اس بنا پر کہ اس کی ذاتِ اقدس عبادت اور پرستش کے لائق ہے۔

یہ نظریہ اس وجہ سے غلط ہے کہ معصومینؑ کے علاوہ دوسرے افراد

---

[1] سورۂ حجر - آیات ۳۹-۴۰ [2] مرآت العقول، جلد ۲- صفحہ ۱۰۱

کے لیے عبادت کی اس منزل پر پہنچنا ممکن نہیں ہے اور جو چیز ممکن نہ ہو اس کے لیے کسی کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ دوسرے لفظوں میں عبادت کی یہ منزل عام لوگوں کے بس کی بات نہیں اور یہ بھی محال ہے کہ خدا ایسا کام کرنے کا حکم دے جو ایک عام انسان سے نہ ہو سکتا ہو۔

علاوہ ازیں مذکورہ بالا آیات سے پتا چلتا ہے کہ اگر عبادت خوف یا حرص کی بنا پر کی جائے تو وہ صحیح ہے کیونکہ خدا ان دو آیتوں میں ان لوگوں کی تعریف کرتا ہے جو اسکو خوف یا حرص کیوجہ سے پکارتے ہیں اور اسکی عبادت کرتے ہیں۔ یہ مدح اور تعریف ان لوگوں کے اس عمل کے صحیح اور پسندیدہ ہونے کا پتا دیتی ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ خدا نے یہ عمل انجام دینے کا حکم دیا ہے اور اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کے نقطۂ نگاہ سے عمل کی یہ منزل کافی ہے۔

ائمہ معصومین علیہم السلام سے بھی ایسی روایات نقل کی گئی ہیں جو اس طرح کی عبادت کے صحیح ہونے پر دلالت کرتی ہیں جو خوف یا حرص کی بنا پر کی جائے [1]

---

[1] محمد بن یعقوب کلینی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ:

عبادت کی تین قسمیں ہیں۔ کچھ لوگ خوف کی بنا پر خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ یہ غلاموں کی عبادت ہے۔ ایک اور گروہ اجر اور ثواب کی خاطر عبادت کرتا ہے۔ یہ مزدوروں کی عبادت ہے۔ ایک تیسرے گروہ کے لوگ ہیں جنہیں خدا کا عشق اس کی عبادت پر آمادہ کرتا ہے۔ یہ آزاد بندوں کی عبادت اور بہترین عبادتوں میں سے ہے۔

شیخ صدوق نے بھی اسی مضمون کی ایک روایت نقل کی ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

گزشتہ صفحات میں ہم نے وضاحت کی ہے کہ سورۂ حمد کی ابتدائی آیتوں کے مطابق حمد اور سپاس خدا کی ذات اقدس کے لیے مخصوص ہے کیونکہ وہ ذاتی کمال، ربوبیت، رحمت، سلطنت، قدرت اور یوم حساب کا مالک ہے لہٰذا خود ان آیات میں ہی خدا کی عبادت اور پرستش کے مختلف محرکات اور وجوہات کا اشارہ ملتا ہے۔

پس عبادت اور پرستش کا ایک سبب یہ ہے کہ عبادت گزار معبود کے کمال کے باعث اسے پرستش کے لائق سمجھتا ہے۔ یہ آزاد بندوں کی عبادت ہے۔ جو کوئی منفعت حاصل کرنے یا کسی نقصان سے بچنے کا خیال کیے بغیر خدا کی عبادت اور پرستش کرتے ہیں۔ عبادت کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ عبادت گزار معبود کی نعمت اور احسان کا شعور رکھتا ہے اور اسے حاصل کرنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ یہ تاجروں اور مزدوروں کی عبادت ہوتی ہے جو منفعت کی خاطر کام کرتے ہیں۔ بعض اوقات عبادت کی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ انسان کو خدا کی سطوت، قہر اور غضب کا پتا چل جاتا ہے اور وہ سرکشی اور نافرمانی کی سزا کے خوف کی بنا پر عبادت کرتا ہے۔ یہ عبادت غلاموں کی

(پچھلے صفحہ سے آگے) اور امام علی علیہ السلام نے یہی بات ایک اور انداز میں کہی ہے۔ آپ فرماتے ہیں: کچھ لوگ ثواب کے شوق میں عبادت کرتے ہیں، یہ تاجروں کی عبادت ہے۔ کچھ لوگ خوف کی وجہ سے عبادت کرتے ہیں، یہ غلاموں کی عبادت ہے۔ ایک اور گروہ بھی ہے جو خدا کی شکرگزاری کی خاطر اس کی ستائش اور عبادت کرتا ہے۔ یہی عبادت آزاد بندوں کی عبادت ہے۔

نہج البلاغہ، وسائل الشیعہ جلد ا صفحہ ۱۰۔

عبادت ہے جو عموماً اس لیے کام کرتے ہیں کہ انہیں آقا کی جانب سے سرزنش اور سزا کا خوف ہوتا ہے۔

استعانت خدا سے مخصوص ہے

اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے کہ انسان اپنے مختلف امور اور ضروریات میں خدا کے علاوہ دوسرے افراد سے حتیٰ کہ اعمال و عبادات سے مدد طلب کرے۔ خدا اس بارے میں فرماتا ہے:

"صبر اور نماز کا سہارا لو۔[1]"

"نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے سے تعاون کیا کرو۔[2]"

اس نے کہا: "میرے پروردگار نے جو وسائل مجھے دے رکھے ہیں وہ اچھے ہیں۔ پس تم محنت اور قوت سے میری مدد کرو۔[3]"

ان آیات سے پتا چلتا ہے کہ مدد طلب کرنا صرف خدا ہی سے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ ہر شخص سے اور ہر چیز سے مدد مانگی جا سکتی ہے۔

لہٰذا جس استعانت کا آیۂ شریفہ..... وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ میں ذکر آیا ہے اور جو خدا کی ذات سے مخصوص ہے وہ ہر اس طرح کی استعانت نہیں ہے بلکہ اس سے مراد بہتر اور خالص تر عبادت کے لیے خدا سے مدد طلب کرنا نیز بیشتر اور مناسب عبادت کے لیے توفیق حاصل کرنا ہے۔

اس قسم کی استعانت کو خدا سے مخصوص کرنے کا مقصد اس حقیقت کی

---

[1] سورۂ بقرہ۔ آیت ۴۵

[2] سورۂ مائدہ۔ آیت ۲

[3] سورۂ کہف۔ آیت ۹۵

نشاندہی کرتا ہے کہ انسان کے اختیاری کام جبر اور تفویض کی دو حالتوں کے درمیان انجام پاتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ کام اور عبادت خود انسان کے اختیار اور ارادے سے کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جملہ "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" میں عبادت کا انجام دینا خود اس سے منسوب کیا گیا ہے لیکن یہ اعمال اختیاری اور ارادی ہوتے ہوئے بھی خدا کی مدد سے وابستہ ہیں جو ہر لحظہ اس کی جانب سے عنایت کی جاتی ہے۔ یہ عنایت مسلسل اور دائمی ہے اور صورت یہ ہے کہ اگر یہ مدد ایک لحظہ کے لیے بھی منقطع ہو جائے تو بندہ عبادت کی تکمیل نہیں کر سکتا اور وہ کوئی عبادت اور نیک عمل انجام نہیں دے سکتا۔

جبر اور تفویض کا یہ درمیانی نظریہ انسان کے اعمال اور افعال کے بارے میں بہترین نظریہ ہے اور خدا پر خالص ایمان اس کا متقاضی ہے اور اس کی تائید کرتا ہے کیونکہ عقیدۂ جبر کے مطابق ضروری ہے کہ خدا گنہگاروں کو ان اعمال کی سزا دے جن کے انجام دینے پر وہ مجبور ہیں جبکہ غیر اختیاری کام کی سزا دینا صریحاً ظلم ہے اور خدا اس چیز سے پاک ہے: "سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰی عَمَّا یَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا کَبِیْرًا"۔

جہاں تک عقیدۂ تفویض کا تعلق ہے اس کے مطابق ضروری ہے کہ ہم خدا کے علاوہ ایک اور پیدا کرنے والے کے قائل ہوں کیونکہ تفویض کا مفہوم اور اس کے معنی یہ ہیں کہ بندے اپنے اعمال اور افعال کے معاملے میں آزاد ہیں، اور اپنے اعمال کے خالق اور انہیں وجود میں لانے والے ہیں۔ یہ طرز فکر خدا سے شرک ہے اور اس عقیدے پر مبنی ہے کہ پیدا کرنے والے کئی ایک ہیں۔

لہٰذا کہنا چاہیے کہ جبر اور تفویض ہر دو نظریے باطل ہیں اور انکے درمیان ایک تیسرا راستہ یہ ہے کہ بندوں کے افعال اور اعمال خود ان کے اپنے

ہیں اور وہ انہیں اپنے اختیار سے انجام دیتے ہیں اور اسی بنا پر جزا اور سزا کے حقدار ہوتے ہیں اور دوسرے پہلو سے خود خدا بھی بندوں کے اعمال میں دخیل ہے کیونکہ وہ انہیں مسلسل طور پر حیات، قدرت اور افعال کے لوازمات عنایت کرتا ہے اور اس کی یہ عنایت لحظہ بھر کے لیے بھی منقطع نہیں ہوتی۔

پس انسان اپنے اعمال اور افعال میں آزاد نہیں ہے اور خدا کے تسلط اور قدرت کے مقابلے میں اس کے تصرف کا رتی بھر امکان نہیں۔

ہم نے اعجاز قرآن کی بحث میں، مسئلہ جبر و اختیار کو مفصل طور پر بیان کیا ہے[1] اس مقام پر اس آیت کے مفہوم اور استعانت کے ذاتِ خداوندی کے ساتھ مخصوص ہونے کی وجوہات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان معنی کی بنا پر یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اگر خدا کی عنایت شامل حال نہ ہو تو بندوں سے کوئی عمل صادر ہی نہیں ہو سکتا، خواہ اس عمل کو وجود میں لانے کے لیے تمام انسان اور جن ایک دوسرے کی مدد اور معاونت بھی کریں کیونکہ یہ ایک امرِ محال ہے کہ جو موجود خود ممکن ہے، اپنے وجود اور ہستی کے لیے محتاج ہے اور ذاتی طور پر کوئی اختیار نہیں رکھتا وہ اپنے کام انجام دینے میں مختار ہو اور محتاج نہ ہو۔

اس بیان سے جملہ "اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کے "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" کے بعد آنے کی وجہ بھی واضح ہو جاتی ہے کیونکہ خدا پہلے جملہ "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" کے ذریعے عبادت کو اپنی ذات سے مخصوص کرتا ہے یعنی مومنوں کو چاہیے کہ وہ خدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں اور پھر جملہ "اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کے ذریعے وہ ان پر واضح کرتا ہے کہ گو عبادت وہ خود انجام دیتے ہیں لیکن یہ عمل اس مدد اور تائید کی بدولت

---

[1] ملاحظہ فرمائیے "فلسفۂ معجزہ" مؤلفہ آیت اللہ خوئی، مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی

ظہور پذیر ہوتا ہے جو انہیں خدا کی طرف سے حاصل ہوتی ہے لہٰذا ہر بندہ خدا کی عنایت اور مشیت کا احسانمند ہے اور خدا اپنے بندوں کے نیک اعمال میں خود ان کے مقابلے میں زیادہ اہم اور مؤثر ہے کیونکہ وہ ہر عمل کی توفیق اور اس کے لیے قوت دیتا ہے جیسا کہ ہر بندہ اپنے برے اعمال اور گناہوں کے لیے خدا سے زیادہ سزاوار ہے کیونکہ وہ انہیں اپنے اختیار سے انجام دیتا ہے[1]

---

[1] حسن وشا ناقل ہے کہ میں نے امام علی رضا علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا خدا نے تمام کام اپنے بندوں کے سپرد کر دیے ہیں؟ انھوں نے جواب میں فرمایا: نہیں بلکہ خدا اس سے بالاتر ہے کہ خلقت کے معاملات اپنے بندوں کے سپرد کر دے۔ میں نے کہا: اس کا یہ مطلب ہوا کہ خدا لوگوں کے کاموں میں دخیل ہے اور انہیں گناہوں پر مجبور کرتا ہے۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: نہیں بلکہ خدا انصاف ور، دانا اور عادل ہے اور اس امر سے بالاتر ہے کہ لوگوں کو گناہ پر مجبور کرے۔ امام نے مزید کہا کہ خدا نے فرمایا ہے: اے فرزندِ آدمؑ! میں تیرے مقابلے میں تیرے نیک اعمال سے زیادہ نزدیک ہوں کیونکہ تو نے انہیں اس قوت، توفیق اور وسائل کے ساتھ انجام دیا ہے جو میں نے تجھے دیے ہیں اور اپنے برے کاموں اور گناہوں کے لیے تو مجھ سے بڑھ کر ذمہ دار ہے۔ (وافی۔ جلد ا صفحہ ۱۱۹) کیونکہ یہ گناہ انسان اپنے اختیار سے کرتا ہے اور خدا اسے فقط قوت عمل اور اختیار بخشتا ہے۔

اس روایت سے پتا چلتا ہے کہ انسان کے اعمال اور افعال میں نہ تو جبر کا وجود ہے جس کی وجہ سے وہ کوئی کام کرنے پر مجبور ہو اور اس میں اس کی مرضی کا کوئی دخل نہ ہو اور نہ ہی تفویض کا سوال ہے کہ وہ ان کاموں کو انجام دینے میں بالکل آزاد ہو اور خدا کا اس میں کوئی دخل نہ ہو بلکہ اس سلسلے میں ایک درمیانی راستہ یہ ہے کہ انسان کے افعال اور اعمال میں خدا کا بھی دخل ہے کیونکہ وہ اسے قوت، ارادہ، عمل کرنے کی توفیق اور دوسرے ضروری (باقی اگلے صفحہ پر)

شفاعت

قرآن مجید کی چند آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ خدا بندوں کے معاملات کا کفیل اور محافظ ہے۔ ان کے معاملات میں فرمانروائی اور انکا انتظام اس کے دستِ قدرت اور دائرہ اختیار میں ہے۔ وہ اپنی رحمت کے ساتھ حصولِ کمال کی طرف انسان کی رہبری کرتا ہے۔ وہی ہے جو سب سے زیادہ ان کے نزدیک ہے، ان کی آواز سنتا اور ان کی دعاؤں کو قبول فرماتا ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

"کیا خدا اپنے بندوں کے لیے کافی نہیں ہے؟"[1]

"اے رسولؐ! جب میرے بندے تم سے میرے متعلق پوچھیں

(پچھلے صفحہ سے آگے) وسائل مہیا کرتا ہے اور اپنے اعمال میں خود انسان کا بھی دخل ہے کیونکہ وہ انہیں اپنے ارادے اور اختیار کیساتھ انجام دیتا ہے اور کام کرنے والا وہی ہے۔

المختصر جیسا کہ مذکورہ روایت میں بیان کیا گیا ہے انسان کے گناہوں کے مقابلے میں اسکی عبادات اور نیک اعمال میں خدا کا دخل زیادہ ہے کیونکہ نیک اعمال کے معاملے میں وہ انسان کو ارادہ اور قوت بخشنے کے علاوہ دوسرے وسائل بھی مہیا کرتا ہے۔ عمل کی توفیق بھی عنایت کرتا ہے، نیک کام کرنے کی ترغیب بھی دلاتا ہے اور اس کی رہنمائی بھی کرتا ہے لیکن گناہوں کے بارے میں وہ اسے فقط قوت عطا کرتا ہے۔

اسی بنا پر مشہور قول "لاجبر ولا تفویض بل امر بین الامرین" کے ایک معنی یہ ہیں کہ انسان کے اعمال میں نہ جبر ہے نہ تفویض بلکہ ایک تیسرا راستہ وجود رکھتا ہے۔

---

[1] سورۂ زمر۔ آیت ۳۶۔

تو جواب میں ان سے کہہ دو کہ میں ان کے نزدیک ہوں اور اگر
کوئی مجھے پکارتا ہے تو میں اسے جواب دیتا ہوں۔ پس انہیں
چاہیے کہ میرا کہا مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں۔ شاید وہ سیدھے
راستے پر آجائیں لے"

پس انسان جو ایسا خدا اور سہارا رکھتا ہے اسے نہیں چاہیے کہ اپنے جیسے انسان کی شفاعت کا طالب ہو اور اسے اپنے پروردگار کے درمیان واسطہ قرار دے کیونکہ یہ عمل مسافت کو زیادہ، راستے کو طویل اور خالق اور مخلوق کے درمیان فاصلہ پیدا کر دیتا ہے۔ یہ عمل خدا کے علاوہ دوسرے کے سامنے اپنی حاجت کا اظہار ہے۔ بھلا ایک محتاج دوسرے محتاج کے لیے کیا کر سکتا ہے اور ایک گنہگار ایسے شخص کی شفاعت سے کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے جو خود تسلط اور قدرت نہ رکھتا ہو۔ حق تو یہ ہے کہ معاملات کا اختیار خدا کے ہاتھ میں ہے، تمام شفاعتیں اسی کی ہیں۔ آسمانوں اور زمین کی سلطنت اسی کی ہے۔

بلاشبہ کسی دوسرے سے شفاعت طلب کرنا جبکہ خدا نے اسے شفاعت کرنے کی اجازت نہ دی ہو جائز اور روا نہیں ہے لیکن اگر خدا نے کسی کو شفاعت کی اجازت دے دی ہو تو ایسے شخص سے شفاعت طلب کرنا خود پروردگار کی بارگاہ میں عجز اور فروتنی کا اظہار ہے اور ایسی شفاعت کا چاہنا خود اس کے حضور میں بندگی اور عاجزی کا اظہار ہے۔ قرآنی آیات سے پتا چلتا ہے کہ خدا نے اپنے بندوں کو شفاعت کرنے کی اجازت دے رکھی ہے تاہم اس

لے سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۸۶

نے رسول اکرمؐ کے علاوہ ان دوسرے بندوں کا نام نہیں بتایا اور انہیں فرداً فرداً متعارف نہیں کرایا۔ بہ حقیقت اس نے قرآن مجید میں یوں بیان فرمائی ہے:

"وہ شفاعت کا حق نہیں رکھتے سوائے اس شخص کے جس نے خدا سے (شفاعت کا) اقرار لے لیا ہو۔[1]"

"اس دن کسی کی شفاعت کام نہ آئے گی بجز اس کے جس کو خدا نے اجازت دی ہو۔[2]"

"اس کی بارگاہ میں شفاعت کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی بجز اس کے جسے اس نے اس کی اجازت دی ہو۔[3]"

"جب وہ اپنے آپ پر ظلم کریں، اگر اس وقت تم سے پناہ مانگیں اور خدا سے مغفرت طلب کریں اور پیغمبر بھی ان کی مغفرت چاہے تو وہ خدا کو توبہ قبول کرنیوالا مہربان پائیں گے۔[4]"

یہ شفاعت کے بارے میں آیات کے چند نمونے تھے۔ جہاں تک شفاعت کے متعلق ان روایتوں کا تعلق ہے جو رسول اکرمؐ اور ان کے جانشینوں سے نقل کی گئی ہیں وہ معتبر اور متواتر ہیں۔

شیعہ ذرائع سے شفاعت کے بارے میں روایات

اس موضوع پر جو روایتیں شیعہ ذرائع سے نقل کی گئی ہیں وہ حدِ شمار

---

[1] سورۂ مریم - آیت ۸۷
[2] سورۂ طٰہٰ - آیت ۱۰۹
[3] سورۂ سبا - آیت ۲۳
[4] سورۂ نساء - آیت ۶۴

سے باہر ہیں۔ "امامیہ" کے نزدیک شفاعت کا مسئلہ اتنا واضح ہے کہ اسے زیر بحث لانے کی حاجت ہی نہیں البتہ ہم یہاں برکت کی خاطر فقط ایک روایت نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

برقی کتاب "محاسن" میں اپنی اسناد کے ساتھ معاویہ بن وہب سے نقل کرتا ہے کہ اس نے کہا: میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر پوچھی جس میں خدا فرماتا ہے:

"لَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَقَالَ صَوَابًا"

(کوئی شخص کلام نہیں کرتا بجز اس کے جسے خدا اجازت دے اور اچھا کہے)۔

امام نے فرمایا: خدا کی قسم ہم ہیں وہ لوگ جنہیں اجازت دی جاتی ہے اور ہم ہیں سچ بولنے والے، اچھی باتیں کرنے والے۔

معاویہ کہتا ہے کہ میں نے پوچھا: میں قربان ہو جاؤں، آپ بات کرتے وقت کیا کہیں گے؟

امام نے فرمایا: ہم خدا کی تعریف کرتے ہیں، اس کے پیغمبرؐ پر درود بھیجتے ہیں اور اپنے شیعوں کی شفاعت کرتے ہیں۔ خدا بھی ہماری بات کو رد نہیں کرتا۔

کلینی نے بھی کافی میں اس مضمون کی ایک حدیث محمد بن فضیل سے اور اس نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے نقل کی ہے۔[1]

---

[1] بحار الانوار۔ جلد ۳۔ صفحہ ۳۰۱

اہل سنت کے ذرائع سے

شفاعت کے بارے میں روایات

شفاعت کے بارے میں اہل سنت کے ذرائع سے جو متعدد احادیث نقل کی گئی ہیں وہ بھی متواتر ہیں[1] ہم یہاں ان میں سے چند ایک بطور نمونہ پیش کرتے ہیں:

(۱) یزید فقیر، جابر بن عبداللہ سے نقل کرتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: مجھے پانچ ایسی بڑی نعمتیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں: مجھے اس خوف اور رعب سے مدد ملی جو میری طرف سے دشمن کے دل پر طاری ہو گیا؛ زمین میرے لیے جائے سجدہ اور پاک کرنے والی قرار دی گئی، جنگ کا مالِ غنیمت مجھ پر حلال کیا گیا جو مجھ سے پہلے کسی پر حلال نہیں تھا اور مجھے شفاعت کا مقام دیا گیا۔[2]

(۲) انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: میں بہشت میں پہلا شفاعت کرنے والا ہوں گا۔[3]

(۳) ابوہریرہ سے منقول ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہر پیغمبر کے لیے ایک دعا ہے اور میں نے خدا کی اجازت سے اپنی

---

[1] کنز العمال (صفحات ۲۱۵ - ۲۸۰) میں اس موضوع پر اسّی سے زیادہ روایتیں منقول ہیں۔

[2] صحیح بخاری۔ جلد ۱۔ صفحہ ۸۶ [3] صحیح مسلم۔ جلد ۱۔ صفحہ ۱۳۰

دعا کو پس انداز کر رکھا ہے تاکہ قیامت کے دن اپنی امت کی شفاعت کے لیے اس سے استفادہ کروں۔[1]

(۴) ابوہریرہ مزید نقل کرتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: میں قیامت کے دن بنی آدم کا سردار ہوں گا اور میں ہی وہ پہلا شخص ہوں گا جس کی قبر کھولی جائے گی۔ میں پہلا شفاعت کرنے والا ہوں اور پہلا شخص ہوں جس کی شفاعت قبول کی جائے گی۔[2]

(۵) ابوہریرہ یہ بھی نقل کرتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: شفاعت کرنے والی پانچ چیزیں ہیں: قرآن، قرابت، امانت، تمہارا پیغمبرؐ اور اسکے اہلبیتؑ۔[3]

---

۱ شفاعت کے مسئلے کے بارے میں بہت سی روایتیں وارد ہوئی ہیں جن میں سے چند بطور نمونہ اوپر نقل کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک روایت یہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: ہر پیغمبر دعا کا حق رکھتا ہے تاکہ وہ دعا کرے اور اس کی دعا قبولیت کے مرحلے تک پہنچے لیکن میں نے یہ حق محفوظ کر لیا ہے تاکہ قیامت کے دن اسے اپنی امت کی شفاعت کے لیے استعمال کروں۔

یہ حدیث مندرجہ ذیل کتابوں میں مذکور ہے:

صحیح بخاری فصل دعا (جلد ۷، صفحہ ۱۴۵)۔ صحیح مسلم (جلد ۱ صفحہ ۱۳۰)۔ بروایت انس وجابر موطا مالک مطبوعہ مصطفیٰ محمد (جلد ۱ صفحہ ۱۶۶) بروایت ابوہریرہ۔ سنن ابن ماجہ مطبوعہ علمیہ پریس مصر۔ (جلد ۲۔ صفحہ ۳۰۱)؛ مسند احمد، بروایت ابوہریرہ جلد ۲ صفحات ۲۷۵۔ ۳۱۳۔ ۱۸۱۔ ۳۹۶۔ ۱۰۹۔ ۴۲۶۔ ۴۳۰۔ اور ۴۸۶ بروایت ابوسعید خدری: (جلد ۳۔ صفحات ۴ ۱۳۔ ۳۰۸۔ ۲۱۸۔ ۲۰۹۔ ۲۵۸۔ ۲۷۶ اور ۲۹۲) بروایت جابر: (جلد ۲۔ صفحات ۳۸۴ اور ۳۹۶) اور بروایت ابوذر: (جلد ۵۔ صفحہ ۱۴۸)۔

۲ صحیح مسلم جلد ۷۔ صفحہ ۵۹ ۳ کنز العمال۔ جلد ۷۔ صفحہ ۲۱۴

(۶۱) عبداللہ بن ابی جدعا نقل کرتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: میری امت کے ایک شخص کی شفاعت کے نتیجے میں قبیلہ بنی تمیم کے افراد سے بھی زیادہ لوگ بہشت میں داخل ہوں گے۔ یہ حدیث ترمذی اور حاکم نے بھی نقل کی ہے۔[1]

ان روایتوں سے پتا چلتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ رسول اکرمؐ اور آپ کے اہل بیت علیہم السلام سے شفاعت طلب کرنے میں قطعاً کوئی حرج نہیں بلکہ یہ ایک ایسا مستحسن امر ہے کہ شریعت بھی اس کی تائید کرتی ہے اور یہی دینی روایات ہمیں اس کی جانب دعوت دیتی ہیں اور رہنمائی کرتی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے باوجود شفاعت کو شرک اور اسے طلب کرنے والے کو مشرک کس بنا پر سمجھا جاتا ہے۔

خدا ہمیں نفسانی خواہشات کی متابعت سے محفوظ اور قدموں اور قلموں کی لغزش سے اپنی پناہ میں رکھے۔

---

[1] کنز العمال۔ جلد ۷، صفحہ ۲۱۴

سورۂ فاتحہ کے باقیماندہ حصے کی تفسیر

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝

قرائت کا انداز

مشہور قاریوں نے کلمہ "غیر" کی تلاوت "جر" اور دھیمی آواز کے ساتھ کی ہے لیکن زمخشری نقل کرتا ہے کہ رسول اکرمؐ اور عمر اس کی قرائت "نصب" کے ساتھ کرتے تھے۔

ہمارا خیال ہے کہ پہلی قرائت ہی صحیح ہے کیونکہ "نصب" کے ساتھ قرائت کی روایت رسول اکرمؐ سے ثابت نہیں ہوئی اور اگر آنحضرتؐ یوں قرائت فرماتے تو لازمی طور پہ زیادہ لوگ اسے نقل کرتے اور یہ مروج ہو جاتی جبکہ معتبر اور ثقہ لوگوں نے اسے رسول اکرمؐ سے نقل نہیں کیا اور اگر بالفرض عمر

کا یوں قرأت کرنا ثابت بھی ہو جائے تو وہ حجت اور دلیل نہیں ہو سکتا اور جیسا کہ ہم نے پیشتر ثابت کیا ہے غیر معصوم کی قرأت اس صورت میں اعتماد اور اطمینان کے قابل ہے جب وہ مشہور قرائتوں میں سے ہو ورنہ اس قسم کی قرائتیں جو نہ معصوم سے ثابت ہوں اور نہ ہی مشہور ہوں وہ خدا کے حکم کی تعمیل اور شرعی ذمہ داری کے ساقط ہونے کا موجب نہیں بن سکتیں۔

علاوہ ازیں مشہور قرارت یہ ہے: "صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ"۔ لیکن امیر المومنین ع اور عمر سے یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ وہ اس آیت کی قرارت یوں کرتے تھے: صِرَاطَ مَنْ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَغَیْرِ الضَّآلِّیْنَ۔

تاہم امیر المومنین علیہ السلام سے قرأت کی یہ صورت ثابت نہیں ہوئی بلکہ اس کے برعکس ثابت ہے کیونکہ اگر آپ اس شکل میں قرأت فرماتے تو یہ آپ کے شیعوں میں رائج اور مشہور ہو جاتی اور آپ کے بعد میں آنے والے ائمہ بھی یہی قرأت اختیار فرماتے اور اس کی تائید کرتے حالانکہ ایسی کوئی بھی روایت کسی معتبر شخص کے ذریعے سے نقل نہیں کی گئی۔

جہاں تک عمر کی قرأت کا تعلق ہے جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں اگر بالفرض یہ روایت ثابت بھی ہو جائے تو یہ سند اور دلیل نہیں بن سکتی۔

مفردات اور ترکیبات

صِرَاط: اس کے معنی راستے کے ہیں جس پر چل کر انسان اپنے مقصد تک پہنچتا ہے۔ بعض اوقات یہ سیدھا راستا جو انسان کو اس کے مقصد تک پہنچاتا ہے محسوس نہیں کیا جا سکتا بلکہ روحانی ہوتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے

کہ "احتیاط نجات کا راستا ہے" اور "خدا کی اطاعت بہشت کا راستا ہے"۔
ان دو جملوں میں "احتیاط" اور "اطاعت" کو راستے کا نام دیا گیا ہے اور انہیں راستے کا نام دینا تشبیہ اور کنائے کے طور پر ہے یا اس کی وجہ یہ ہے کہ "راستا" لغت میں جامع اور عام معنی رکھتا ہے جس میں یہ معنی شامل ہیں۔

استقامت

اس کے معنی اعتدال کے ہیں اور اعتدال انحراف کی ضد ہے یعنی انسان راستا چلتے ہوئے دائیں اور بائیں جانب منحرف نہ ہو اور جھک نہ جائے لہٰذا صِرَاطِ مُسْتَقِیم وہ راستا ہے جو راہرو کو خدا کی ابدی نعمت اور بہشت تک پہنچاتا ہے۔ یہ راستا اس چیز سے عبارت ہے کہ مخلوق اپنے خالق کی اطاعت کرے، وہ جو کام کرنے کا حکم دے اور جن کاموں سے منع کرے ان کے بارے میں اس کی مخالفت نہ کرے اور اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرے۔ یہ وہی سیدھا راستا ہے جس میں کوئی کجی اور انحراف نہیں ہے۔ خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"بے شک تم لوگوں کی رہنمائی سیدھے راستے کی طرف کرتے ہو[1]۔
(یعنی) اس خدا کے راستے کی طرف کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے
اور جو کچھ زمین میں ہے اسی کا ہے۔[2]"

"یہی ہے تمہارے پروردگار کا راستا ــــ سیدھا راستا[3]"

"بے شک خدا ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے۔ پس اسکی عبادت
کرو کیونکہ یہی سیدھا راستا ہے[4]۔"

---

[1] اور [2] سورۂ شوریٰ۔ آیات ۵۲ - ۵۳

[3] سورۂ انعام۔ آیت ۱۲۶   [4] سورۂ آل عمران۔ آیت ۵۱

"میری عبادت کرو کیونکہ یہی سیدھا راستا ہے[1]۔"

"خدا کے ساتھ اپنے عہد و پیمان کو پورا کرو۔ خدا تمہیں ان باتوں کا حکم دیتا ہے تاکہ تم عبرت حاصل کرو[2] اور یہی میرا سیدھا راستا ہے جس میں کوئی کجی نہیں۔ اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کیونکہ وہ تمہیں خدا کے راستے سے تتر بتر کردیں گے[3]"

چونکہ خدا کی عبادت کا کوئی خاص اور مقررہ طریقہ نہیں ہے بلکہ وہ سب نیک اور اچھے کام جو انسان کے اعضاء کے ذریعے انجام پاتے ہیں اور وہ سب صحیح اور درست ارادے اور خیالات جو انسان کے دل و دماغ سے جنم لیتے ہیں ان میں شامل ہیں، ان سب کو عبادت کا نام دیا جاتا ہے لہٰذا بعض اوقات لفظ صراط کے بھی جامع معنی لیے جاتے ہیں جو ان تمام افعال اور عبادتوں پر محیط ہوتے ہیں اور تمام ظاہری اور باطنی عبادتیں ان میں شامل ہوتی ہیں۔ اس صورت میں مفرد لفظ استعمال ہوتا ہے مثلاً "صراط مستقیم" اور "صراط سوی" اور بعض اوقات یہ لفظ ان اعمال اور عبادتوں میں سے ایک ایک کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان، قیامت پر ایمان، نماز، روزے، حج وغیرہ کا ادا کرنا۔ اس صورت میں لفظ صراط جمع کے کلمے "سُبُل" کے ساتھ استعمال ہوتا ہے جیسا کہ قرآن مجید کی متعدد آیات میں آیا ہے:

"قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ[4]"

---

[1] سورۂ یٰسین - آیت ۶۱
[2] اور [3] سورۂ انعام - آیات ۱۵۲ - ۱۵۳
[4] سورۂ مائدہ - آیت ۱۵

"يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلٰمِ[1]"
(بے شک تمہاری طرف خدا کی جانب سے نور اور ایک صاف صاف بیان کرنے والی کتاب آچکی ہے۔ جو لوگ خدا کی خوشنودی کی پیروی کرتے ہیں وہ اس سے انہیں سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے)۔

"وَمَا لَنَا أَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللَّهِ وَقَدْ هَدٰنَا سُبُلَنَا[2]"
(ہم خدا پر توکل کیوں نہ کریں جبکہ اس نے ہمیں راستوں کی جانب ہدایت کی ہے)۔

"وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا[3]"
(جو لوگ ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں ہم انہیں اپنے راستوں کی جانب ضرور ہدایت کریں گے)۔

انعام

یہ لفظ احسان اور وافر نعمت دینے کے معنوں میں آیا ہے۔ جن لوگوں کو خدا نے وافر نعمت بخشی ہے، وہ وہی اشخاص ہیں جو سیدھے راستے پر چلے ہیں اور حرص و ہوس اور خطرناک نفسانی خواہشات انہیں شیطان کی اطاعت پر مائل نہیں کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ابدی سعادت، دائمی زندگی اور لامحدود روحانی لذتیں حاصل کی ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ انہیں خدا کی

---

[1] سورۂ مائدہ۔ آیت ۱۶ [2] سورۂ ابراہیم۔ آیت ۱۲

[3] سورۂ عنکبوت۔ آیت ۶۹

خوشنودی بھی نصیب ہوئی ہے:

"خدا نے باایمان مردوں اور عورتوں سے بہشت کے ان باغوں کا وعدہ کر لیا ہے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان جاودانی باغوں میں بڑے خوبصورت اور پاکیزہ مکان ہیں اور خدا کی خوشنودی ان سب سے بالاتر ہے۔ یقیناً یہ فوزِ عظیم ہے۔"[1]

غضب

اس کے معنی سخط (غصہ) کے ہیں اور اس کے مقابلے میں رحمت ہے۔ مَغضُوبِ عَلَیہِم سے مطلق کفار مراد نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو کفر میں غوطہ ور رہیں اور سچائی سے دشمنی رکھیں اور خدا کی نشانیوں کا مذاق اڑائیں۔

"لیکن جو شخص جی کھول کر کفر کرے ایسے لوگوں پر خدا کا غضب ہے اور ان کے لیے بڑا سخت عذاب ہے۔"[2]

ضلال

اس کے معنی گمراہی کے ہیں اور اس کے مقابلے میں ہدایت ہے۔ گمراہ لوگ وہ ہیں جو ایسا راستا اختیار کرتے ہیں جو سیدھا اور ہدایت کا راستا نہیں ہوتا اور یہ راستا انہیں ابدی تباہی اور دائمی عذاب کی طرف لے جاتا ہے لیکن ان گمراہ لوگوں کا کفر اور ان کی بے دینی اتنی شدید نہیں ہوتی جتنی

---

[1] سورۂ توبہ۔ آیت ۷۳   [2] سورۂ نحل۔ آیت ۱۰۶

اس گروہ کی ہے جسے مَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ کہا گیا ہے یعنی جن پر خدا غضبناک ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ یہ لوگ بوجہ غفلت خدا کے راستے میں تحقیق اور کوشش نہ کرنے کے نتیجے میں سیدھے راستے سے بھٹک گئے ہیں اور گمراہی میں پڑ گئے ہیں لیکن بہرحال اگر حقیقت ان پر واضح ہو جاتی تو وہ ضد اور سرکشی سے کام نہ لیتے لیکن مَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ کے گروہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں پر حق و صداقت روزِ روشن کی طرح عیاں بھی ہو جائے تب بھی وہ اپنی ضد پر اڑے رہتے ہیں۔

بعض روایات میں کہا گیا ہے کہ مَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ کا گروہ یہود اور "ضَالِّيْنَ" یعنی گمراہوں کا گروہ مسیحی ہیں۔

اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قرآن کی آیات کسی معین موقع کے لیے مخصوص نہیں ہوتیں اور آیات کے جو معنی بیان کیے جاتے ہیں وہ ان کے عام معنی کے مصادیق سے مطابقت کے طور پر ہوتے ہیں اور اسے تفسیر بہ مصداق کہتے ہیں۔ مَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ اور ضَآلِّيْنَ کے معنوں کے بارے میں یہ حدیث بھی اسی قسم کی ہے اور حقیقی اور مفہومی تفسیر نہیں بلکہ تفسیر بہ مصداق ہے۔

اعراب اور حرکات

"غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ" جملہ "اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" کا بدل ہے یا "اَلَّذِيْنَ" کی صفت ہے اور اس کا صفت ہونا اس بنا پر ہے کہ خدا کی نعمت اس کی رحمت کی طرح تمام بنی نوع انسان کے لیے عام ہے لیکن ایک گروہ اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہے اور دوسرا ناشکری کرتا ہے جیسا کہ اس آیہ شریفہ میں اشارہ کیا گیا ہے:

"کیا تم نہیں دیکھتے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسے خدا
نے تمہارے تابع کر دیا ہے اور اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں
تمہارے لیے عام کر دی ہیں اس کے باوجود بعض لوگ ہیں جو
خدا سے جھگڑتے ہیں حالانکہ ان کے پاس نہ علم ہے، نہ ہدایت
اور نہ ہی کوئی روشن کتاب ہے"[1]۔

مختصر یہ کہ خدا کی رحمت کی طرح اس کی نعمتیں بھی وسیع اور عام ہیں اور لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو خدا کی طرف سے نعمت دی گئی ہے۔ ان سب کو عام طور پر دو گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے یعنی شاکر گروہ اور کافر گروہ۔

یہاں دوسری صفت "غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ" کا فائدہ ظاہر ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جملہ "اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" کا اطلاق ان سب لوگوں پر ہوتا ہے جنہیں نعمت دی گئی ہے لیکن دوسری صفت اس کے مفہوم کو محدود کر دیتی ہے اور اسے پہلے گروہ کے لیے مخصوص کرتی ہے یعنی ان لوگوں کے لیے جو خدا کی طرف سے دی گئی نعمتوں کے لیے اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔

لہٰذا بطور خلاصہ آیت کا مطلب اور مفہوم یہ ہوگا کہ نماز ادا کرنے والا بندہ ان جملوں کے ذریعے خدا سے التجا کرتا ہے کہ وہ اسے نیک بندوں کے راستے پر چلائے۔ خدا کے نیک بندے دو صفتیں رکھتے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا نے انہیں وافر نعمت دی ہے "اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" اور دوسری صفت یہ ہے کہ وہ ان خداداد نعمتوں سے غلط فائدہ نہیں اٹھاتے اور ناشکری کا راستا نہیں اپناتے۔ وہ ایسے لوگوں کی طرح نہیں ہوتے جن پر خدا کا غضب نازل ہوا ہو یا جو گمراہ ہو گئے ہوں۔ "غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝"

ان لوگوں کو جس طرح دنیا کی نعمتیں نصیب ہوتی ہیں اسی طرح اطاعت

---

[1] سورۂ لقمان۔ آیت ۲۰

اور نیک انسانی اعمال کی بدولت وہ آخرت کی نعمتیں بھی حاصل کر لیتے ہیں اور یوں دنیا و عقبیٰ دونوں ہی میں فوز و فلاح ان کے حصے میں آتی ہے۔

لفظ "غَيْر" کے وصف قرار پانے کے بارے میں آیۂ شریفہ کی نظیر یہ جملہ ہے: "يجوز اقتناء كل كتاب غير كتب الضلال" یعنی گمراہ کن کتابوں کے علاوہ ہر قسم کی کتابیں اپنے پاس رکھنا جائز ہے۔ اس جملے میں "غير كتب الضلال" وصف کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

لہٰذا بعض لوگوں کے اس قول کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ لفظ "غَيْر" مبہم الفاظ میں ہے اور یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اضافے کی وجہ سے معرفہ بن جائے اور "اَلَّذِيْنَ" کا کہ جو معرفہ ہے وصف ہو جائے۔ پس لازمی طور پر یہ کہنا چاہیے کہ یہ جملہ ترکیب کے لحاظ سے "اَلَّذِيْنَ" کی صفت نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے جملے کا بدل ہے۔

یہ ان باتوں کا خلاصہ ہے جو اس سلسلے میں کہی گئی ہیں لیکن جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کی روشنی میں ان اقوال کی اور جو کچھ ان کے جواب میں کہا گیا ہے اس کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب ایک قضیے میں کسی عمل کا ذکر ہو ——— خواہ وہ قضیہ خبری ہو یا انشائی ——— اور اس عمل میں تمام افراد شامل ہوں اور وہ سب کے لیے عام ہو تو جس طرح ہم دوسرے لفظوں کے ساتھ کسی چیز کو خاص بنا لیتے ہیں اسی طرح لفظ غَيْر کے ساتھ بھی توصیف کر سکتے ہیں اور اسے خاص بنا سکتے ہیں مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ: "جَاءَنِيْ جميع اهل البلاء" یا اکرم جميع اهل البلا غير الفاسقين"۔ ان دو جملوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ لفظ "غَيْر" "اهل البلا" کے وصف کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

ضالین

یہ "غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ" کے جملے پر عطف ہے اور لفظ "لا" کی تکرار نفی کی تاکید کے لیے کی گئی ہے تاکہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ مغضوب ہونے اور گمراہ ہونے کو ملا کر ان کی نفی کی گئی ہے بلکہ ان آیات میں ان میں سے ہر ایک کو بجائے خود نیکیوں سے جدا، الگ اور دور کیا گیا ہے کیونکہ لفظ "غَیْر" بھی ہر جملے میں ضمنی طور پر نفی پر دلالت کرتا ہے اور حرف نفی کی بجائے استعمال ہوا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے:

"جالِسْ رجلاً غیرَ فاسقٍ ولا سیّئ الخلق"۔ (ایسے شخص کی ہم نشینی اختیار کر جو فاسق اور بد اخلاق نہ ہو) اور "اعبد اللہ بغیرِ کسلٍ ولا مللٍ" (خدا کی عبادت کرو بغیر اس کے کہ تم سستی برتو یا تھک جاؤ) ہم دیکھتے ہیں کہ ان دو جملوں میں لفظ "غَیْر" نفی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

لیکن بعض علماء نے جن کا تعلق تقریباً موجودہ دور سے ہے، یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ نفی کے معنی میں "غَیْر" کا استعمال درست نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس بات پر مجبور ہو گئے کہ اس آیت کی ایک خاص طرز پر توجیہہ اور تصحیح کریں۔ چنانچہ انہوں نے اس سلسلے میں اپنے آپ کو زحمت اور تکلیف میں بھی ڈالا لیکن وہ کوئی تسلی بخش بات نہیں کہہ سکے اور بالآخر اپنی بے بسی کے معترف ہو گئے۔

تفسیر

سابقہ آیات میں خدا نے اپنے بندوں کو تلقین اور ہدایت فرمائی ہے

کہ وہ بندہ ہونے کا اعتراف کریں، اس کی وحدانیت کی گواہی دیں اور اس سے مدد طلب کریں۔ اس کے بعد موجودہ آیۂ شریفہ میں خدا انہیں تلقین فرماتا ہے کہ وہ اس سے التجا کریں کہ وہ ان کی رہنمائی سیدھے راستے (صراط مستقیم) کی جانب کرے۔

اس سورۂ مبارکہ کا آغاز خدا کی حمد و ثناء سے ہوتا ہے کیونکہ وہی تعریف اور توصیف کے لائق ہے اور اس کا اختتام بھی اس سے ہدایت طلب کرنے پر ہوتا ہے۔ اس ابتدا اور انتہا کے درمیان خدا نے "اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ" کا جملہ نازل فرمایا ہے جو دراصل سابقہ تعریف و توصیف کا نتیجہ اور بعد میں کیے جانے والے سوال اور گزارش کی تمہید ہے کیونکہ سابقہ تعریف و توصیف عبادت کے خدا ہی سے مخصوص ہونے کی بنیاد اور اس سے مدد طلب کرنے کا مقدمہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا اپنے ذاتی کمال اور رحمت کی بدولت اور اس قدرت اور سلطنت کی بنا پر جو فقط اسی کے لیے مخصوص ہے، عبادت کے لائق ہے اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا عبادت کے لائق ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ لائق پرستش ہونے کے اوصاف سے عاری ہوتا ہے جو خدا کی ذاتِ اقدس سے مخصوص ہیں۔

چونکہ سورت کے شروع میں جو تمہید باندھی گئی ہے، اس کے مطابق عبادت اور مدد خدا ہی سے مخصوص ہے اس لیے انسان کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ ہدایت اور رہبری کی درخواست بھی خدا ہی سے کرے کیونکہ اس نے عبادت اور مدد کو اسی کی ذات اقدس سے مخصوص کیا ہے اور فقط اسی کو اس کے قابل سمجھا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ شیعہ اور سنی دونوں ذرائع سے نقل کیا گیا ہے کہ خدا نے

اس سورت کو اپنے اور بندوں کے درمیان تقسیم کر دیا ہے۔ اس کا نصف حصہ خدا کے لیے اور نصف بندے کے لیے ہے۔ جب بندہ کہتا ہے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" تو خدا فرماتا ہے: میرے بندے نے میری تعریف کی ہے اور جب وہ کہتا ہے "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" تو خدا فرماتا ہے: یہ میرے بندے کے لیے ہے اور میرا بندہ جو کچھ مانگتا ہے میں اسے دوں گا۔[1]

اس سے پہلے اس امر کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ انسان اپنے اعمال اور نظریات کے سلسلے میں جس راستے کا انتخاب کرتا ہے وہ مندرجہ ذیل تین راستوں میں سے کوئی ایک ہوتا ہے:

۱۔ وہ راستا جو خدا نے اپنے بندوں کے لیے تجویز کیا ہے۔ یہ راستا وہ لوگ اختیار کرتے ہیں جن کی خدا نے اپنے فضل اور احسان سے ہدایت فرمائی ہے۔

۲۔ وہ راستا جس کا انتخاب گمراہ لوگ کرتے ہیں۔

۳۔ وہ راستا جو "مَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ" یعنی وہ لوگ اختیار کرتے ہیں جو مورد غضب قرار پاتے ہیں۔

پہلا راستا وہی ہے جسے سیدھا راستا یا صراط مستقیم کہا جاتا ہے اور اس راستے کو اس آیت میں دوسرے دو راستوں سے یوں علیحدہ کیا گیا ہے کہ صراط مستقیم پر چلنے والے ان دو راستوں پر چلنے والوں سے الگ ہیں۔ یہ ان کی ضد ہیں اور ان کا مقام ٹھیک ان کی مخالف سمت میں ہے۔ ان کی

---

[1] عیون الاخبار الرضا، مطبوعہ ایران ۱۳۱۷ھ (صفحہ ۱۶۶) اس سے ملتی جلتی ایک روایت بسم اللہ کے سورۂ حمد کے جزو ہونے کے بارے میں ہم نے ابوہریرہ سے نقل کی ہے۔

صفات اور خصوصیات ان سے جدا ہیں اور یہ اپنی مخصوص نشانیاں اور علامتیں رکھتے ہیں۔ اپنی انہیں خصوصیات، صفات اور علامات کی وجہ سے یہ ان لوگوں سے ممیز ہوتے ہیں اور پہچانے جاتے ہیں۔

یہ ہے خلاصہ ان آیات کا ان راستوں کے بارے میں جو انسان اپنی زندگی میں اختیار کرتا ہے۔ اس بیان کے ساتھ خدا اس نکتے کی جانب بھی اشارہ کرنا چاہتا ہے کہ جو شخص سیدھے راستے سے ہٹ جاتا ہے اور دوری اختیار کرتا ہے وہ لازمی طور پر بدبختی کا راستا اختیار کرتا ہے جس پر چل کر یا تو گمراہ ہو جاتا ہے اور یا گمراہی کے ساتھ ساتھ غضب الٰہی میں بھی گرفتار ہو جاتا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ خدا ہمیں گمراہی اور بدبختی سے بچائے اور ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت فرمائے۔

ہدایت کے بارے میں گفتگو

مفسرین نے آیۂ اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ کے بارے میں کہا ہے کہ جو شخص ہدایت کا طالب ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے وہ ہدایت سے عاری ہو تاکہ وہ اسے خدا سے طلب کر سکے لہٰذا کیا وجہ ہے کہ ایک خدا شناس اور خدا پرست مسلمان جو پہلے سے ہدایت یافتہ ہے وہ نماز کی حالت میں خدا کی بارگاہِ اقدس سے ہدایت طلب کرے اور بار بار کہے "اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ"

اس سوال یا اعتراض کے جواب میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی جا سکتی ہے:

۱۔ کہا گیا ہے کہ اس آیت میں ہدایت سے مراد ہدایت کا مسلسل جاری رہنا اور انسان کا اس پر ثابت قدم رہنا ہے اور اس کے بعد کہ خدا نے

اپنے فضل اور عنایت سے نماز پڑھنے والے شخص پر احسان کیا ہے اور ایمان اور توحید کی جانب اس کی ہدایت کی ہے۔ وہ خدا سے گزارش کرتا ہے کہ یہ نعمت اسے ہمیشہ حاصل رہے تاکہ ہدایت پانے کے بعد وہ کسی لغزش کا مرتکب نہ ہو اور وہ ہدایت کے راستے سے بھٹک نہ جائے۔

۲۔ کہا گیا ہے کہ اس آیت میں ہدایت سے مراد ثواب اور اعمال کا اجر ہے۔ لہٰذا آیت کے معنی یوں ہوں گے کہ نماز پڑھنے والا عرض کرتا ہے کہ اے پروردگار! میرے نیک اعمال اور عبادتوں کے بدلے میں مجھے وہ سیدھا راستا عنایت کر جو انسان کو بہشت اور نیک بختی سے ہمکنار کر دیتا ہے۔

۳۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ شاید ہدایت طلب کرنے سے مراد زیادہ ہدایت طلب کرنا ہو کیونکہ ہدایت میں کمی بیشی ہو سکتی ہے اور جو شخص ہدایت کے کسی مرتبے کو پہنچ گیا ہو وہ اس سے زیادہ کامل مرتبے کے لیے درخواست کر سکتا ہے۔

لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ تمام وجوہات اور احتمال من گھڑت ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان کے بارے میں آیۂ شریفہ سے کچھ مستفاد نہیں ہوتا بلکہ یہ اس آیت کے ظاہر سے بھی قطعاً مطابقت نہیں رکھتے کیونکہ آیت کا ظاہری مطلب رہنمائی اور ہدایت طلب کرنے کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔

اس بارے میں صحیح جواب یہ ہے کہ وہ ہدایت جو ایک مسلمان نماز پڑھتے ہوئے خدا سے مانگتا ہے ایک ایسی ہدایت ہے جو اسے پہلے سے حاصل نہیں ہے اس کے لیے وہ اللہ تعالے سے گزارش کرتا ہے کہ اس قسم کی ہدایت بھی اسے عنایت کرے۔

اس قول کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ خدا جو ہدایت عطا کرتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک عام ہدایت ہے اور دوسری خاص ہدایت۔ عام ہدایت بعض اوقات تکوینی ہوتی ہے اور بعض اوقات تشریعی۔

عام تکوینی ہدایت وہ ہے جو خدا نے تمام موجودات کی فطرت میں خواہ وہ جمادات ہوں، نباتات ہوں یا حیوانات ہوں ودیعت کر رکھی ہے جس کی بنا پر یہ موجودات فطری طور پر اپنے اختیار کے ساتھ ارتقا اور کمال کی جانب رواں دواں ہیں۔ کمال حاصل کرنے کی قوت اور کمال کی جانب سفر کی خواہش خدا نے روزِ اول سے ہی ان کی فطرت میں رکھ دی ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ کس طرح نباتات کی رہنمائی نشو و نما کی جانب کی گئی ہے کہ وہ اس کمال کی جانب بڑھ رہے ہیں اور اس سفر میں وہ اس سمت میں حرکت کرتے ہیں جس میں ان کی حرکت کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ حیوانات کو بھی تکوینی ہدایت حاصل ہے اور وہ فطری طور پر ان افراد میں جو انہیں تکلیف اور اذیت پہنچاتے ہیں اور ان افراد میں جو انہیں تکلیف اور اذیت نہیں پہنچاتے تمیز کر سکتے ہیں اور انہیں پہچان سکتے ہیں مثلاً چوہا بلی کو دیکھ کر بھاگ جاتا ہے لیکن بھیڑ کو دیکھ کر نہیں بھاگتا۔ اسی طرح چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کو معاشرہ اور حکومت تشکیل دینے، گھر بنانے اور ضروریات زندگی مہیا کرنے کے لیے فطری طور پر ہدایت دی گئی ہے۔ اسی تکوینی ہدایت کے نتیجے میں بچے اپنی پیدائش کے ابتدائی دنوں میں ماں کا پستان تلاش کر لیتے ہیں اور انکی رہنمائی دودھ کی شکل میں اپنی خوراک حاصل کرنے کی جانب کی جاتی ہے۔

مندرجہ ذیل آیۂ شریفہ میں جو خدا حضرت موسیٰؑ کی زبان سے نقل فرماتا ہے، تکوینی ہدایت کی اسی منزل کی جانب اشارہ کیا گیا ہے:

(موسیٰؑ) نے کہا: "ہمارا پروردگار وہی ہے جس نے ہر چیز کو ہستی کا لباس بخشا اور پھر اس کی ہدایت اور رہنمائی فرمائی[1]"

عام تشریعی ہدایت

جہاں تک عام تشریعی ہدایت کا تعلق ہے یہ وہی ہدایت ہے جو خدا نے تمام بنی نوع انسان کو پیغمبروں کی طرف آسمانی کتابیں بھیج کر مہیا فرمائی اور ان پر اپنی حجت تمام کر دی ہے کیونکہ اس نے انہیں عقل کے علاوہ سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنے کی قوت دی ہے اور پھر پیغمبر بھی بھیجے ہیں تاکہ وہ خدا کی آیتیں ان کے سامنے پڑھیں اور خداوندی قوانین اور احکام بیان کریں۔ خدا نے پیغمبروں کی رسالت کے ساتھ معجزوں اور منطقی دلائل کو منسلک کر دیا ہے تاکہ وہ ان کے اقوال کی سچائی کی دلیل بنیں اور ان کے دعوے کی تائید کریں۔

بعض لوگ اس عام ہدایت سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور بعض گمراہی کا راستا اختیار کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل آیت میں اسی عام تشریعی ہدایت کا ذکر آیا ہے:

"ہم نے اس (انسان) کی رہنمائی نیک بختی (کے راستے) کی جانب کی ہے۔ اب چاہے وہ شکر گزار ہو اور چاہے ناشکری کا اظہار کرے[2]"

خاص ہدایت

یہ ایک قسم کی تکوینی ہدایت اور خدا کی عنایت ہے اور وہ اپنی حکمت کے

---

[1] سورۂ طٰہٰ - آیت ۵۰ [2] سورۂ دہر - آیت ۳

مطابق اس قسم کی ہدایت اپنے بعض بندوں کے لیے مخصوص کر دیتا ہے اور ان کے لیے کمال کی منزل تک پہنچنے کے وسائل فراہم کرتا ہے۔ اگر خدا ان پر خاص توجہ نہ فرماتا، ان کے لیے کمال حاصل کرنے کے وسائل مہیا نہ کرتا اور انہیں انحراف اور بدبختی سے محفوظ نہ رکھتا تو وہ یقیناً گمراہی اور ضلالت میں مبتلا ہو جاتے۔

خدا کی ان خاص مہربانیوں اور مخصوص عنایتوں کو خاص ہدایت کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں اس خاص ہدایت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن میں سے چند بطور نمونہ درج ذیل ہیں:

"اس نے ایک گروہ کی ہدایت کی اور دوسرے گروہ کی گمراہی یقینی ہے[1]"

"کہہ دو کہ واضح دلیل خدا کی طرف سے ہے اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت کرتا[2]"

"ان کی ہدایت تمہارے بس کی بات نہیں مگر ہاں خدا جسے چاہے ہدایت کرے[3]"

"خدا ہرگز ظالموں کی ہدایت نہیں کرتا[4]"

"خدا جسے چاہے راہ راست کی ہدایت کرتا ہے[5]"

"تم جس شخص کو چاہو ہدایت نہیں کر سکتے لیکن خدا

---

[1] سورۂ اعراف - آیت ۳۰ [2] سورۂ انعام - آیت ۱۴۹

[3] سورۂ بقرہ - آیت ۲۷۲ [4] سورۂ انعام - آیت ۱۴۴

[5] سورۂ بقرہ - آیت ۲۱۳

جسے چاہے ہدایت کرے۔[1]"

"جن لوگوں نے ہماری راہ میں جہاد کیا ہم ضرور انہیں اپنی راہ کی ہدایت کریں گے۔[2]"

"خدا جسے چاہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہے ہدایت کرتا ہے اور وہی سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔[3]"

ان سب آیات اور بہت سی دوسری آیات سے جو اس موضوع پر نازل ہوئی ہیں پتا چلتا ہے کہ خدا کی توجہ اور عنایتیں سب لوگوں کے لیے نہیں بلکہ ایک معین گروہ کے لیے مخصوص ہیں اور اسی کو خاص ہدایت کا نام دیا جاتا ہے۔

نتیجہ

اب جبکہ اس بیان کے ساتھ ہدایت کی قسمیں اور خاص ہدایت کے معنی واضح ہو گئے ہیں، زیر بحث آیت کے معنی بھی خود بخود واضح ہو جاتے ہیں اور وہ یہ کہ ایماندار اور نمازی شخص سورت کے آغاز میں اس بات کا اعتراف اور اقرار کرتا ہے کہ خدا نے اس پر احسان کیا ہے اور عام تکوینی اور تشریعی ہدایت کے ذریعے اس کی رہنمائی کی ہے اور اس کے بعد وہ اپنے کریم اور ہدایت دینے والے پروردگار کی بارگاہ میں التجا کرتا ہے کہ اس کی رہنمائی خاص تکوینی ہدایت کی جانب بھی کرے جو معدودے چند بندوں کے لیے مخصوص ہے۔ اسی لیے وہ کہتا ہے:
اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝[4]

---

[1] سورۂ قصص۔ آیت ۵۶ [2] سورۂ عنکبوت۔ آیت ۶۹

[3] سورۂ ابراہیم۔ آیت ۴ [4] تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں "فلسفۂ ولایت"۔

المختصر چونکہ انسان فطری طور پر ہلاکت اور سرکشی کی زد میں ہے لہٰذا بہت سے عوامل اس کی نیک بختی کے لیے خطرے کا موجب بنتے ہیں اور بہت سی رکاوٹیں اور دقتیں اس کی ہدایت اور روحانی اور اخلاقی ارتقا کے راستے میں موجود ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مسلمان کے لیے یہ ہرگز مناسب نہیں کہ وہ صرف اپنے آپ پر بھروسہ کرے بلکہ اسے ہمیشہ اپنے پروردگار سے مدد مانگنی چاہیے، اس کی پناہ طلب کرنی چاہیے اور اس سے ہدایت اور رہنمائی کی درخواست کرنی چاہیے تاکہ وہ کسی دِقت یا رکاوٹ کا سامنا کیے بغیر راہِ راست پر چل سکے اور انسانی مقصد اور منزل کمال تک پہنچے اور وہ ان لوگوں میں سے نہ ہو جن پر خدا کا غضب نازل ہوا ہے یا جو گمراہ ہو گئے ہیں۔

الحمد لله على ما أنعم علينا بنشر هذا القسم من الكتاب، راجين منه سبحانه أن ينفع به المسلمين وغيرهم، ويجعله وسيلة إلى معرفة القرآن وفهم أسراره ومغازيه. نسأله التوفيق لإكمال هذا التفسير، فإنّه غاية المسئول ومنتهى المأمول.

والله وليّ التوفيق.



المؤلف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ

اسلام کے حقیقی نظریات اور معارف کے اِدراک اور آپ کے عِلمی، دینی اور رُوحانی ذوق کی تسکین کے لئے

عالمِ اسلام کے جیّد عالموں اور دانشوروں کی تحقیقی کاوشوں پر مبنی اور اپنے مواد کی صحّت، دیدہ زیب کتابت، عمدہ کاغذ اور خوبصورت طباعت سے مزیّن ہونے کی بنا پر جامعہ تعلیماتِ اسلامی کی قابلِ قدر مندرجہ ذیل مطبوعات کتابوں کی دنیا میں یقیناً گرانبہا اضافہ ہیں۔

اسلام دینِ فطرت	جمع از دانشمندان	۲۵/- روپے
اسلام دینِ معاشرت	جمع از دانشمندان	۲۵/- ،،
اسلام دینِ معرفت	محمد صحفی	۵۰/- ،،
اسلام دینِ حکمت	محمد بہشتی۔ جواد باہنر	۱۰۰/- ،،
فلسفۂ معجزہ	آیت اللہ خوئی	۱۵/- ،،
فلسفۂ شہادت	مرتضیٰ مطہری	۱۰/- ،،
فلسفۂ ولایت	مرتضیٰ مطہری	۱۵/- ،،
فلسفۂ احکام	ناصر مکارم، جعفر سبحانی	۴۰/- ،،
فلسفۂ حجاب	مرتضیٰ مطہری	۲۰/- ،،
تاریخ عاشورا	محمد ابراہیم آیتی	۲۵/- ،،
توضیح المسائل	آیت اللہ خوئی	۲۰/- ،،
پاسدارانِ اسلام	محمد حسین طباطبائی	۳۰/- ،،
مکتبِ اسلام	محمد حسین طباطبائی	۳۰/- روپے
مکتبِ رسول	محسن قرائتی	زیرِ طبع
مکتبِ تشیّع	محمد رضا مظفر	۲۰/- ،،
انتظارِ امام	محمد باقر صدر	۸/- ،،
آخری فتح	مرتضیٰ مطہری	۸/- ،،
سخن	مرتضیٰ مطہری	زیرِ طبع
فُزتُ بربِّ الکعبہ	محمدی ری شہری	۵/- ،،
تعلیماتِ اسلامی	جمع از دانشمندان	۲۴/-
مردِ انقلاب	مصطفیٰ زمانی	۱۵/-
بُت شکن	مصطفیٰ زمانی	۱۵/- ،،
گفتارِ عاشورا	جمع از دانشمندان	۱۸/- ،،
جہادِ اکبر	امام خمینی	ز[illegible]

اس کے علاوہ بچّوں کے لیے قرآنی قاعدے اور دینی قصّے بھی دستیاب [illegible]

جامعہ تعلیمات اسلامی پوسٹ بکس: ۵۴۲۵ کراچی۔ پاکستان